اُنّیس سو تراسی

مصنف: کلیم لاشاری
مترجم: شاہد حنائی

اُنیس سو تراسی

مصنف: کلیم لاشاری

مترجم: شاہد حنائی

اُنّیس سو اَسی

مصنّف: **کلیم لاشاری**

مترجم: شاہد حنائی

پہلی اشاعت : جون ۲۰۱۱ء
کمپوزنگ : لیزر پلس، فون: 32751324
قیمت : ۳۰۰/ روپے
جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

Unnees So Tirasi
(Short Stories)
by Kaleem Lashari
Translated by Shahid Hinai

Kitab Market, Office# 17, St.# 3,
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph: (92-21) 32751428
e-mail:a.bazyaft@yahoo.com

خالدہ کے نام

فہرست

اُردو ترجمے پر گواہی	کلیم لاشاری	۹
چند باتیں	کلیم لاشاری	۱۳
عرضِ مترجم	شاہد حنائی	۳۰

○

اُنیس سو ترا سی		۳۳
مرسی کلنگ		۷۶
جنگ		۸۴
سزا		۹۹
جہنم		۱۱۵
اثر		۱۳۱
بین		۱۳۹
عوام		۱۴۳

بے رُت موسم	۱۴۸
روتا ہوا پھول	۱۵۳
سچائی	۱۵۷
مریض	۱۷۶
سوزن	۱۸۶

اُردو ترجمے پر گواہی

مجھے یاد ہے کہ ضیائی آمریت کے اندھیروں میں جب دم گھٹا جاتا تھا تو کئی ایک چھوٹی بڑی تحریکوں نے جنم لیا۔ عوامی جدوجہد کے نئے ڈھنگ اور رنگ دیکھنے کو ملے۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ مختلف طبقہ ہائے فکر وعمل کے لوگوں نے اپنے تئیں فوجی آمریت کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا۔ لوگوں کی اس اٹھتی ہوئی پکار کو دبانے کے لیے سرکار کا آہنی ہاتھ خوف ناک حدوں تک جانے کو تیار تھا۔ فوجی عدالتیں انصاف کی دہلیز پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے ہوئے تھیں۔ سمری ملٹری کورٹس سرسری انصاف فراہم کرتے ہوئے دورِ جاہلیت کی سزائیں سناتی رہیں۔ ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے، پریس کی جدوجہد شروع ہوئی۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ صحافیوں کو کوڑے مارے گئے، جیلیں مہمان خانہ بنیں، جریدوں کے ڈکلیریشن کینسل ہوئے، اخبار بند ہوئے۔ بعد ازاں وکلا نے بھی اس اندھیر کے خلاف جدوجہد کا ساتھ دیا— گرفتاریاں پیش کی گئیں— اس ضمن میں بھی بہت کچھ تھا جس نے دل کو بری طرح تکلیف پہنچائی۔ اور پھر ایم آر ڈی کی ناقابلِ فراموش جدوجہد جب پاکستان کے دیہی علاقوں نے آگے بڑھ کر آمریت کے سارے ہتھکنڈوں اور ظالمانہ کارروائیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے، پوری ہمت اور حوصلے کے ساتھ اس تحریک کو جاری رکھا۔ کئی جانیں قربان ہوئیں— نوجوانوں کی جوانی زندانوں کی نذر ہوئی۔ سماج کی اعلیٰ قدریں شدید بحران کا شکار ہوئیں۔ تاریکی کے بیوپاریوں نے معاشرے میں موجود کشادہ دلی، آزادہ خیالی اور درگزر کے گیت گاتی ہوئی دیوی کا گلا گھونٹنے کا مصمم ارادہ کرلیا اور تنگ

نظری کے عفریت کو آزاد کردیا۔ کیوں کہ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ سیاسی سمجھ بوجھ کا پھیلاؤ بالآخر ان کے قابو سے نکل جائے گا اور اس کا روکنا ناممکن ہوجائے گا۔ ہمیشہ سیاسی تحریکوں کی قیادت پاکستان کے بڑے شہروں نے کی ہے لیکن اس مرتبہ یہ عجیب نظارہ تھا جس نے انھیں ڈرا دیا، وسیع خطے پر پھیلی ہوئی آبادی ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں آمریت کو للکار رہی تھی۔ ایسے وقت میں اور چیزوں کے ساتھ ساتھ سرکاری ایما پر جیلیں ٹوٹیں، پختہ کار مجرم فرار ہوکر دیہی علاقوں میں پہنچے اور ڈاکا اور اغوا ہر روز کا معمول بن گیا۔

اس دور میں چند افسانے سرزد ہوئے۔ شاید غم و غصے کی وہ چیخ تھی جو حلق پھاڑتی ہوئی نکلی تھی۔ چوں کہ ملک تاریک ترین اشاعتی دور سے گزر رہا تھا تو یاروں نے کسی ویران دفتر کی سائیکلو اسٹائل مشین کو گرمایا اور اس طرح ان افسانوں کو share کرنے کی سعی کرلی۔ کچھ سال اسی طرح گزر گئے، لیکن پھر ہوائی جہاز کے حادثے کے بعد فوراً ہی حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور وہ افسانے باضابطہ اشاعت پذیر ہوئے۔ ان کے علاوہ ایک دو افسانے ایسے بھی تھے جو لکھے گئے اور رسائل میں چھپے۔ جنھیں بعد میں یاروں نے یک جا کرنے کی سبیل کی اور چھوٹا سا مجموعہ سندھی زبان کے قارئین کے ذوق ادب کی آبیاری کے لیے میسر ہوگیا۔ اُسی وقت سے ان کے ترجمے کے تقاضے ہونے لگے تھے۔

بہرحال اکیڈمی ادبیات پاکستان نے اپنے اشاعتی پروگرام میں علاقائی مزاحمتی ادب کی جلدیں شائع کیں اور یہ میرے علم میں ہے کہ وہاں بھی ایک آدھ افسانہ ترجمہ ہوا۔

بہرکیف ایک عرصے کے بعد ایک نوجوان پوچھتے پوچھتے میرے دفتر میں وارد ہوا اور بڑی بے باکی سے متقاضی ہوا کہ میں افسانے لکھا کروں۔

مجھے حیرت تو ہونا ہی تھی لیکن کچھ غصہ بھی آیا جس کی کوئی وجہ تو نہ تھی اور میں جس کا اظہار بھی کسی طور نہیں کرسکتا تھا— اپنی روایتی نرم روی کو برقرار رکھتے ہوئے میں نے گفتگو کو تعارفی رسومات کی طرف موڑا اور اس طرح تھوڑی دیر کے لیے اس اذیت کو کم کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا، جو اس خیال سے پیدا ہوئی تھی کہ میں واقعی ایک عرصے سے تخلیقی عمل سے دور تھا۔ اس دُوری کے کئی ایک جواز پیش کرنے کے لیے ذہن ہمہ وقت

مستعد مصاحب کی طرح آموجود ہوا تھا اور شاید میں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا بھی ہوں گا— لیکن مجھے اس بات کا دکھ بھی ایک بار پھر شدت سے ہوا تھا کہ افسانہ نہیں ہو رہا۔ شاہد حنائی ان صاحب کا نام ہے، سندھی کے کئی افسانوں کے ترجمے وہ کر چکے تھے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ شاید میرا ایک افسانہ وہ اردو میں ترجمہ کر چکے تھے اور وہ شائع بھی ہو چکا تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ وہ گاہے بہ گاہے خیر خبر لیتے رہتے تھے۔

ان کہانیوں کا لہجہ قاری کے لیے شاید کچھ اجنبی ہو— اور ہوسکتا ہے کہ ترش بھی، لیکن مجھے یقین ہے کہ اردو زبان، جس میں موضوعات کی فراوانی ہے، وہ نہ صرف ان کہانیوں کو اپنے وسیع دامن میں جگہ دے گی بلکہ یہ افسانے ایک خاص طبقۂ فکر کی داد ضرور پائیں گے، جو سماج میں روا ظلم اور زیادتی کو قدرتی آفات نہیں جانتے بلکہ ان کے اسباب و علل کے متلاشی ہوتے ہیں اور جو ادب کو زندگی سے مربوط جانتے ہیں۔ ادب بہتے پانی کی طرح ہے جو اپنی راہ خود بناتا ہے اور کئی ایک نئے میدان سینچتا چلا جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ان افسانوں کی اشاعت کا باعث بنی۔

جیسے ذکر ہوا تھا کہ کچھ احباب کا ترجمے کے سلسلے میں ہمیشہ اصرار رہتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کام میں خود احسن طریقے سے کرسکتا ہوں۔ لیکن ایسا کوئی خیال کبھی میرے دل میں جگہ نہیں پاسکا۔ اگر وقت میسر ہو تو بندہ کوئی نیا کام کرے۔ تحقیق کسی حریص خاتون کی طرح کب وقت بچنے دیتی تھی، کئی ایک اہم موضوعات تشنۂ قلم تھے۔ اور پھر اگر کسی طور ان سے بھی فراغت ہوجاتی تو تخلیق کی دیوی کے قدموں پر کچھ نئے پھول نچھاور کرنے والے خیال کی کشش کو کیسے روکا جاسکتا تھا؟ یہ بھی حقیقت ہے کہ تحقیق کی دنیا کے ساتھیوں نے اس ضمن میں بات بڑھانی چاہی تھی۔ ڈاکٹر اسما ابراہیم کا خیال تھا کہ کسی طور سندھی میں لکھی گئی میری تحریریں ترجمہ ہوجائیں اور انھیں احساس تھا کہ میں اس سلسلے میں کوئی دل چسپی نہیں لوں گا۔ انھوں نے مجھ سے ذکر کیے بغیر، اپنے تئیں جناب نثار حسین سے کسی موزوں مترجم سے متعلق رائے چاہی۔ شاہد حنائی سے بھی اس کا ذکر کیا۔ شاید خطوط پر لکھی گئی میری کتاب سے متعلق کچھ پیش رفت بھی ہوئی۔ شاہد حنائی کویت کو سدھارے اور ہم امریکا۔

اچانک ایک دن شاہد کا فون آیا، کچھ زیادہ باتیں انھوں نے شاید نہیں کیں، البتہ اتنا یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے کہانیوں کے ترجمے سے متعلق ذکر ضرور کیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد پھر فون پر یہ انکشاف ہوا کہ مزید افسانے ترجمہ ہو چکے اور اب ان کی اشاعت ہونی چاہیے۔ اور تو اور انھوں نے برادرم مبین مرزا کا نام بھی تجویز کر دیا۔ اب جب سب کام وہ کر چکے تو ان کے مشورے کو صائب جانا اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا گیا۔ شاید اپنی کوتاہیوں کا خیال اس کے پس پردہ ہو۔ بہرحال مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی تو دل کو اطمینان ہوا کہ ناشر نہیں ایک ادب دوست سے اور ادیب سے معاملہ ہوا ہے۔ حنائی صاحب کی طرف سے لگائے گئے کوتاہی اور تاخیر کے تمام الزامات کا کفارہ اگرچہ ممکن نہیں، پھر بھی ایسی صورتِ حال پیدا ہو ہی گئی ہے کہ باور ہو سکے کہ ہم اتنے بھی غافل نہ تھے — اب رہی بات شاہد حنائی کے ترجمے کی تو ان افسانوں کو پڑھ کر میں گواہی دیتا ہوں کہ انھوں نے یہ کام قاعدے اور قرینے سے، محنت اور محبت سے کیا ہے۔

پاکستانی معاشرہ تیزی سے خود شکستگی (Self defeating) کی خو (Tendency) سے بربادی کی طرف گامزن ہے اور بدنصیبی سے اس کے سدِباب کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ عمرانیات اور سیاسیات کے ماہرین شاید اس کے اسباب و علل پر کچھ کہتے ہوں، لیکن ہم ایسے لوگ صرف اس سماج کی تصویریں ہی پیش کر سکتے ہیں جو ہمارے ذہن پر کسی کیمرے کے شیشی پردے کی طرح نقش ہو گئی ہیں۔ شاید اسی طرح ہم اپنا غم و غصہ، اپنی یاس و ناامیدی، اپنی بے بسی و کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے دھیمے اور لطیف لہجے میں اصلاحِ احوال چاہتے ہیں۔

ادیب مصلح اور رہنما نہیں ہوتے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ادب دل کے تاروں کو چھو لینے کی طاقت رکھتا ہے اور بسا اوقات ایک ایسے نغمے کی دُھن عالمِ وجود و شہود میں آجاتی ہے جو مثبت تبدیلی کی نوید ثابت ہوتی ہے۔

اسی امید اور آرزو کے ساتھ یہ کتاب اردو قارئین کی نذر کی جا رہی ہے۔

کلیم لاشاری

چند باتیں

عام طور پر سننے میں آتا ہے کہ ''جناب زمانے سے کتب بینی کا شوق رخصت ہوا!'' لیکن حال ہی میں بھارت میں منعقدہ عالمی کتب میلے کی رونق دیکھ کر یہ ساری باتیں سراسر جھوٹ لگتی ہیں۔ پرگنی میدان کی وسعتوں میں بڑے بڑے اسٹالوں پر، جنوبی ایشیا کے تمام چھوٹے بڑے پبلشروں کی مطبوعات بے چین نگاہوں کے تجسس کا جواب اپنے اندر سمیٹے، برجستہ انداز میں، سماج میں کتب کی اہمیت واضح کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ میلہ گھومنے والے کتابوں کے تھیلے بھر بھر کے لوٹ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر اطمینان اور خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ کتابوں کا من ایک عالم کا ذہن ہے۔ یہ شاعر کے گداز حساس دل کی مانند نفیس ہے۔ یہ سائنس دان کے وسیع دماغ کا عکس ہے۔ وہ کسی ادیب کی لطیف بیانی کے حسن سے پُر خزینہ ہے یا کسی فن کار کی کاوشوں کا عظیم شاہکار، اور ہوسکتا ہے کہ یہ کسی محقق کا مشاہدات سے بھرپور تجزیہ ہو۔

کتاب کے اندر جستجو کی لگن، الفاظ کے چھتیس لباسوں☆۱ میں ڈھکی دلھن کی طرح اپنی سکھیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہے۔ قاری، رانا☆۲ کی مانند اپنی مومل☆۳ کی تلاش میں

☆۱۔ چھتیس لباس: دلھن کو جہیز میں ملنے والے ۳۶ جوڑے۔

☆۲۔ رانا: سندھ کی لوک داستان ''مومل رانو'' کا کردار جس کا اصل نام 'مینڈھا' تھا۔

☆۳۔ مومل: سندھ کی لوک داستان ''مومل رانو'' کی سورمی کردار رانی۔

کتاب کے کاک محل☆۴ میں داخل ہوتا ہے۔ پھر دل و دماغ کا اک مفید ساتھ جنم لیتا ہے۔ سرمستی اور سرخوشی کے ایسے ماحول میں اپنی ذات کی کھوج کا سنہ شروع ہوتا ہے۔ خارجی حقائق کی مدد سے بے شمار داخلی واہموں کی نقابیں اُترنے لگتی ہیں۔ دوسروں سے آگہی ہوتے ہی خودشناسی کے کئی ابتدائی مرحلے طے ہوجاتے ہیں۔ سنا ہے خودشناسی کے چودہ سالہ بن باس کا سفر کبھی کبھی چودہ کتابوں میں تکمیل کو پہنچتا ہے۔ بدھ کی بے شمار یاتراؤں، لامحدود جستجو اور طویل فاقہ کشی کا حاصل نروان، چند سو صفحات میں نصیب ہوجاتا ہے۔

پرائمری اسکول کے زمانے میں اپنے محلے میں واقع میمن ویلفیئر ایسوسی ایشن کے ریڈنگ روم میں اخبارات و رسائل کا مطالعہ اور نزدیک والی لائبریری سے کہانیوں کی کتابیں لے کر پڑھنا روز کا معمول تھا۔ ہائی اسکول میں داخلہ کیا ملا، گویا قرب و جوار کے محلوں میں آنے جانے کا ویزا مل گیا۔ انجمنِ ترقیِ اردو اور دیگر بڑی لائبریریوں تک رسائی ممکن ہوئی، جہاں سلیمان کا خزانہ تھا اور حیرت زدہ ہم۔ علم کے اس خزانے کے روبرو خوشی اور جاننے کی بے چینی کے ملے جلے جذبات سے متاثر۔ ہائی اسکول کے وہ دو سال ان لائبریریوں میں موجود مواد پڑھنے میں گزر گئے۔ ہر روز کوئی تین چار کتابیں لا کر ختم کرنا اور پھر دوسری کتابوں کی کھوج میں سرگرداں رہنا۔ انجام یہ ہوا کہ اب ہم تھے اور لائبریریوں کی انتظامیہ۔ ہم نئی کتابیں منگوانے پر اصرار کرنا اپنا حق سمجھتے رہے اور انتظامیہ اپنا فرض جان کر کتابیں منگواتی رہی۔ کتب کی آمد میں تاخیر کیا ہوتی جیسے سانس ہی رُک سا جاتا ہو۔ خود بھی ہر ماہ چند کتابیں ڈاک سے منگوایا کرتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ مطالعہ کرتے بلکہ جی جان سے سنبھال کر رکھتے۔ ہم نے ہٹلر اور مسولینی کے محض نام ہی نہیں سن رکھے تھے، بلکہ وہ ہماری پڑھی ہوئی کئی کہانیوں اور داستانوں کے اہم کردار بھی تھے۔ اسی طرح 'لارنس آف عربیہ' ہمارے واسطے دیگر کلاس فیلوز کی طرح صرف ایک فلم کا نام نہیں تھا، بلکہ کئی کتابوں کا موضوع بھی تھا۔ اس کے کردار کے حوالے سے نیکی اور بدی کی کئی بحثیں

☆۴۔ کاک محل: سندھ کی لوک داستان ''مومل رانو'' میں مومل کا محل جو جیسلمیر ریاست میں دریا کے کنارے پر بنوایا گیا تھا۔

پھٹریں اور اختتام پذیر ہوئیں، لیکن اس کی شخصیت کا جادو ایک زمانے تک سر چڑھ کر بولتا رہا۔

ایشمین جنگی جرائم کے حوالے سے معتوب ضرور تھا مگر ساتھ ساتھ چند سوالات اٹھانے کا موجب بھی تھا۔ جنگی جرائم اور اس حوالے سے یہودی لابی کی بے انتہا دل چسپی اس وقت ہمارے لیے حیران کن تھی۔

نورمبرگ میں جنگی عدالت کی کارروائی بین الاقوامی انصاف کے اصولوں سے یکسر انحراف لگ رہی تھی۔ دنیا کے جنگی قوانین صدیوں سے جن بنیادوں پر کھڑے تھے، وہ ریزہ ریزہ ہوگئیں۔ نورمبرگ کی طرح ٹوکیو میں بھی جنگی جرائم کی عدالت لگی۔ فاتح کے فتح کے نشے اور مدہوشی میں انجام دیے گئے، کارنامے، ہنسنے کی وجہ تو بنے ہی تھے، ساتھ ساتھ رونے کا سامان بھی مہیا کر گئے۔ اس پس منظر میں ہرمن گورنگ جیسا rascal ہماری نگاہوں کے سامنے ہیرو بن کر ابھرا۔ وہ تمام وقت عدالت کے سامنے گردن اٹھائے بیٹھا رہا۔ جب اسے سزائے موت سنا کر مقتل لے جایا جا رہا تھا تو عین اسی وقت وہ خود کو ختم کر کے سرکار کی ایما پہ ہونے والی انصاف کی یک طرفہ کارروائی پہ طنز کرتا ہوا شان سے رخصت ہوگیا۔

یوں کثرتِ مطالعہ نے داستانوں اور دیومالائی قصوں کو حقائق سے علاحدہ کر دیا، لوک ادب اور تاریخی داستانوں میں فرق واضح ہوتا گیا۔ سائنس اور فلسفے کا اپنا اپنا تشخص قائم ہوا۔ قصوں اور افواہوں کا طلسم مکمل طور پر ٹوٹ گیا۔ راسپوتین ایک جادوگر نہ رہا، اہم حکومتی شخصیات اور خود زارِ روس (Czar)☆۵ پر وہ جو اثرات رکھتا تھا، اس کے واسطے کسی قسم کے منتروں کی تلاش فضول تھی۔ کتب نے روسی سماج کی برائیاں کھل کر بتائیں۔ معاشرے میں اخلاقی انحطاط کی جو بھی وجوہات تھیں، جن کی وجہ سے لوگوں کا سیاسی سسٹم اور سماجی تعلق سے یقین اُٹھ چکا تھا۔ اب ہر کسی کو نیک روحوں کے کرم اور برگزیدہ ہستیوں کی دعاؤں کی حاجت تھی۔ روسی سماج کے اکابرین میں راسپوتین کی قدر و اہمیت اسی طرح بڑھ گئی تھی، جس طرح آج یہاں اربابِ اقتدار ننگ دھڑنگ لالن لاشاری☆۶ کی زیارت

☆۵۔ زار (Czar): شاہانِ روس کا لقب۔

☆۶۔ لالن لاشاری: شمالی سندھ کا ایک مست حال درویش۔

کی خاطر ویرانوں کا رُخ کرتے ہیں۔

ذہن کو سوچ کا مواد ملا، تاریخ کے مخفی گوشے آشکار ہونے لگے۔ اور ادب کے رموز بچپن کی معصوم امنگوں کو متاثر کرنے لگے۔ ماتا ہری کا نام کسی رقاصہ کی حسین جلوہ نمائیوں سے کہیں بلند تر ہوکر، ممالک کے خارجی تعلقات میں جاسوسی جیسے عنصر کی اہمیت اجاگر کرنے لگا تھا۔ جس کے بعد کم فلبی (Kim Philby) کی شخصیت کا اسرار اور اس کی خدمات کی گہرائی کو سمجھنا دشوار نہ رہا۔

انھی دنوں انقلابِ فرانس پر چند نئی کتابیں چھپی تھیں۔ قارئین کے لیے ان دل چسپ خزانوں میں انتہائی کشش تھی۔ ہر کوئی پہلی فرصت میں ایسی کتابیں پڑھنا چاہتا تھا۔ صبح لائبریری پہنچ کر مطلوبہ کتابوں کی واپسی کا انتظار کرنا معمول کا حصہ بن چکا تھا۔ انقلابِ فرانس میں خود کئی داستانیں پنہاں ہیں۔ انسانی ذات کا خود کو صدیوں کی روایتوں سے الگ کر کے نئے تجربوں کی راہ ہموار کرنے کا عمل حقیقتاً انتہائی اہم قدم تھا۔ سیاسی نظام میں تبدیلی ایک سرا تھی تو دس روزہ ہفتے کا قیام دوسرا سرا، زندگی کی ہر روش پر محیط یہ سلسلہ اس قدر پھیلا کہ انسانی آزادہ روی بھی اس وسعت پر حیران دکھائی دینے لگی۔

انسانی عمل کے جداگانہ نمونوں کے مظہر اس انقلاب کے لیڈر بھی ایک دل چسپ مطالعہ تھے۔ دانتن کا کردار، پر اس کے بے اندازہ رُخ، راسپیر ی کی راست بازی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انتظامی بدحواسی قابلِ دید تھی۔ آزادی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ راست باز قوتوں کو قیامِ نظم و ضبط میں سخت مشکلات پیش آنے لگیں۔ جب انقلاب کا پہیہ گھومتا ہوا تیزی کے ساتھ واپس پلٹا تو اس Black Lash میں خوف ناکی (reign of terror) تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ضابطے کی روایتی قوتوں کو موقع مل گیا۔ کامیاب فوجی جرنیل نپولین بوناپارٹ نے اقدار پر قبضہ کر کے انقلابِ فرانس کے فوائد اپنے بھاری بھرکم فوجی کورٹ کی بڑی بڑی جیبوں میں ٹھونس لیے۔ پشت پناہی کی وجہ سے نپولین کی کامیابیوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ مصر ہو یا اٹلی، اسپین ہو یا جرمن ڈچیز (Duchees)، آسٹریا ہو یا پروشیا، اس کے فوجی فہم و فراست نے ہر ایک کو مطیع کر لیا تھا۔ اس کی شخصیت

کی رومان انگیزی نے کئی مسلمانوں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ عقیدے کے اعتبار سے مسلمان تھا۔ ایسی افواہوں کی سخت برف کو علم کی گرمی نے پگھلایا۔ ہمارے سامنے ایک نہایت ذہین شخصیت تھی، جسے خود گمانی کے زنگ نے کھا لیا تھا۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے لکھا تھا کہ انھیں Emile Ludvig کی تحریر کردہ نپولین کی سوانح حیات والد صاحب نے سال گرہ کے موقعے پہ بہ طورِ تحفہ دی تھی۔ اس عظیم کتاب کے لطف کے کیا کہنے، ایک لکھت کی انفرادیت، دوسرا تند و تیز موضوع، تیسرا یورپ کی بدلتی تقدیر کے نرالے رنگ۔ مرحوم بھٹو تاحیات اس کتاب کے سحر سے نہ نکل پائے۔ افسوس کہ بہت بعد میں چھپنے والا نپولین کا سوانحی ادب ان کی نظر سے نہ گزرا۔ وگرنہ وہ اپنی دانائی کے نمکین اثر سے کسی حد تک آزاد ہو جاتے۔

یورپ کا یہ طوفان (نپولین) کئی تناور برگد اکھیڑتا ہوا اپنی پھرتیوں میں الجھ کر مقاصد سے دور ہو کر اپنی قوت کھو بیٹھا اور سینٹ ہیلینا (St. Helena) پہنچ کر باقی ماندہ زندگی کے دن ایک سیاسی قیدی کی حیثیت سے گزارنے پر مجبور ہوا۔

نپولین کے دل چسپ اور انتہائی پُراثر جیون میں کئی واقعات بذاتِ خود بڑی اہمیت حاصل کر گئے تھے جن کے بغور مطالعے کی وجہ سے متعدد شخصیات کے جادوئی سحر نے لپیٹ لیا تھا۔ روس کے زار، الیکسینڈر کی کم عمری کے باوجود کمال کی تیز فہمی حیران کن تھی جس نے بذریعہ مذہبی اتحاد (Holy Alliance) نپولین کے زوال کا بیج بویا۔ آسٹریا کا ذہین وزیر میٹرنیخ، جو بعد میں چانسلر بنا۔ اس کی کاوشوں نے Congress of Viena میں جدید یورپ کے خدوخال سنوارے۔ خود فرانس کا سابقہ وزیر پرنس ٹیلی رینڈ، جو انقلابِ فرانس سے قبل سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہا تھا، اس نے بعد از انقلاب اور نپولین کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد خود کو وزیرِ خارجہ جیسی اہم حیثیت سے سرفراز کیا، درحقیقت وہ ایک عجیب شخص تھا۔ دوسری طرف برطانوی سیکریٹری آف اسٹیٹ کیسل ریخ (Castlreagh) تھا جس نے یورپ کی نپولین مخالفت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے، بالآخر مکمل طور پر برطانوی فتح جیسا من چاہا نتیجہ حاصل کیا۔ کتابوں کے

اس عجیب میدان میں ہمیں وہ فوجی افسر ملا جو کہ ہندوستان میں بھی معمولی عہدوں پر، سرکاری پالیسیوں پر کامیابی کے ساتھ عمل پیرا تھا۔ جس نے آخرکار یورپ کے اسٹیج پر، یورپی تاریخ کے انتہائی اہم معرکے واٹرلو میں نپولین کو شکست دے کر خود کو امر کر ڈالا۔ ایک ایسی شخصیت ڈیوک آف ولنگٹن کی خود پسندی کے اثرات سے آزاد دکھائی دیتی ہے جو نپولین کی طرح خوامخواہ کے گمان میں مبتلا نہیں۔ وہ اپنی قابلیت سے صرف اعتماد حاصل کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مگر نپولین کی مانند افتخار کے قاتل اثر کا شکار نہیں ہوتا۔

جس طرح انقلابِ فرانس جیسے تاریخی عمل کے ثمرات ضائع ہوئے، وہ ایک تاریخی المیہ تھا۔ اس عجیب تاریخی واقعے کی لامحدود طاقت کو نپولین نے ذاتی مفادات کی سطح تک لا کر یورپ میں ایسا حیرت انگیز نظارہ برپا کیا جس کے اثرات آج تک محسوس کیے جاتے ہیں۔ اس کا بڑا بھائی اسپین کا بادشاہ بنتا ہے، نپولین کا اگ جایا بیٹا (Step son) اٹلی کا چانسلر ہے تو بیٹی جرمن ریاستوں کی رانی۔ یوں بھی یورپ میں شاہی گھرانوں کی آپس میں رشتے داریاں رہتی ہیں، یوں وہ ایک سے زائد ملکوں پر حکومت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کو نظر انداز کر دیں، خود نپولین کا ایک خود سے بڑی عمر کی عورت جوزیفائن سے بیاہ کرنا کوئی کم دل چسپ واقعہ نہیں ہے۔

نپولین نے شادی کرتے وقت پیرس کے میونسپلٹی کلرک کے روبرو جوزیفائن کی عمر پانچ برس کم اور اپنی پانچ برس بڑھا کر بتائی تو بھی دونوں کی عمروں کا فرق نمایاں تھا۔ یورپ کا یہ فاتح جرنیل جوزیفائن کی کافر اداؤں کا گھائل نظر آتا ہے۔ اس کی درد بھری آہیں دفتروں میں موضوعِ بحث بنتی ہیں جو میدانِ جنگ سے نپولین کے حوالے سے موصول ہوتی رہتی ہیں۔

تاریخ اور عشق کی یہ مزے دار کھچڑی پکتی رہی اور ہم، عشق کے ماروں کو مختلف دل چسپیوں سے بہلتے دیکھتے رہے۔ جوزیفائن کی فضول خرچی اور سلطنت کا جانشین پیدا نہ کر سکنے کے باعث نپولین ایسے دوراہے پر جا پہنچا جس کا کم از کم ایک راستہ اسے تباہی کی طرف لے جانے والا تھا۔ یہ جوا اس کی ڈپلومیٹک صلاحیتوں کا بھرپور امتحان تھا۔ ہم حیرت زدہ

دیکھتے ہیں کہ نپولین یہ جوا ہار گیا، عجلت بازی کی وجہ سے روسی شاہ کی بہن کا رشتہ نہ مل سکا اور اس نے آسٹریا کی شہزادی کے ساتھ شادی کی۔ اگر کوئی یہ جوا اور اس کے نتیجے میں ملنے والی شکست کی اذیت محسوس کرنا چاہے تو کتابیں یہ سب کچھ واضح اور تفصیلی انداز میں بتاتی ہیں۔ نپولین کی آخری دنوں کی یادیں، جوزیفائن کی ایامِ جوانی کی تکالیف اور میری لوئی کی بے وفائیوں کے دکھوں سے بھری پڑی ہیں۔

فرانسیسی سماج کی اس بدلتی کیفیت کی پرچھائیاں وہاں کے ادب پر بھی پڑیں۔ فرنچ ناولوں کے تراجم بڑی تعداد میں موجود تھے۔ سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے جس طرح افراد متاثر ہو رہے تھے، اس سے سیاسی واقعات کی ماہیت کو سمجھنے میں مدد دی۔ مشہور ادبی شہ پارہ "The Charter House of Parma" سیاست، ذاتی مفادات اور جذبات کا ایسا مشترکہ احوال ہے جس میں قاری کی دل چسپی انتہائی حدوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نپولین کی فوج میں ایک نوجوان افسر ہے، وہ واٹرلو کی جنگ میں شریک تو ہے مگر اُسے حالات کی نزاکت کا مکمل ادراک نہیں۔

اسٹینڈ ہال اپنے ہنر کے عروج پر نظر آیا۔ فرانس کے ان حالات کی ایک کھلی تصویر تھی، جس نے میرے دل میں سیاسی افراتفری کے دوران فرد کی بے بسی کی پوری کیفیت واضح کر ڈالی۔ تاریخ میں جو انقلاب محض واقعات لگتے تھے، ان کے پیچھے ظلم اور تکالیف کے کتنے معاملات تھے جو سمجھ آنے لگے۔ ہر شے اعتقاد، فرض، بہادری اور قربانی کے بڑے ناموں سے الگ ہوکر اپنے حقیقی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آئی۔

فرانسیسی ادب میں بالزاک (Honre de Balzac) بہت نامور ادیب تھا، اس کا مشاہدہ اور سماج کی تصویر کشی کی صلاحیت اس قدر بھرپور تھی کہ گمان گزرتا جیسے وہ میری انگلی پکڑ کر، اس وقت کے فرانس کی سیر کرا رہا ہو۔ اس کی ناولوں میں وقت اور لوگوں کا مزاج مکمل طور پر منجمد تھا۔ فرشتہ صفت کرداروں کی نیکیوں اور شیطانیت سے بھری برائیوں کے تذکرے، ہر بات تو تھی۔

وکٹر ہیوگو کے تاریخی ناولوں کا اثر الیکسینڈر ڈوما سے قطعی مختلف تھا۔ مگر اس عمر

میں ڈوما کی ناولیں زیادہ اثر رکھتی تھیں۔ یاد پڑتا ہے کہ اچھا ناول ختم کرنے کے بعد اگلے دو دن تک کوئی دوسرا ناول پڑھ نہیں سکتا تھا۔ ذہنی دنیا ناول کے ماحول کا حصہ بن جاتی تھی اور نئے کردار لبھا نہیں سکتے تھے۔

کارمن کی کہانی تو ایسی تھی جس کی لفظیات نے Prosper Merimee سے روشناس کرایا۔ کہانی کا ہیرو ڈان جوزے اک طویل عرصے تک ڈوما کے بندوقچیوں کی طرح شعور کے اُفق پر موجود رہا۔ میریمی سے تعلق جُڑ جانے کی وجہ سے اس کے دیگر اشغال سے قربت بڑھی، ایک آرکیالوجی، دوسرا تھا روسی ادب۔

متعدد فرنچ ناولوں کے محور حقیقت نگاری اور فطرت پسندی تھے۔ اس ضمن میں فلوبیئر کی دقیق نظری نے شاہکار تخلیق کر دکھائے۔ رومان پسندی پر Madam Bovary سے زیادہ تنقید شاید ہی کہیں دکھائی دی ہو۔ اپنے کام کے ساتھ صداقت اور محنت، اس کی تحقیق میں جھلکتی ہے جو وہ اپنی ناولوں کے سلسلے میں کرتا تھا۔

گانکو (Edmond Goncourt) کی حقیقت نگاری بھی حد سے تجاوز کی ہوئی لگتی تھی۔ کیا تو ورائٹی تھی۔ ایسی ناولیں بھی نظر سے گزریں، جن کے ذریعے سماجی علوم سے تعارف ہوا۔ یہ ادبا کچھ سخت مزاج معلوم ہوتے تھے اور اپنے کرداروں کے لیے کوئی اچھا تاثر قائم کراتے ہرگز دکھائی نہ دیے۔ ان کے کردار جیسے ماحول گزیدہ ہوں اور وراثت کے اثرات اپنے ساتھ لیے جنم جنم کی اٹل تقدیر کے ساتھ عمر بتاتے ہوں۔ اپنی اس سختی گیری کے باوجود زولا (Emile Zola) نے ایک دل چسپ تاثر قائم کیا تھا۔

اسی تناظر میں موپساں (Guy de Maupassant) مختصر کہانی کا ایسا گرو تھا جس کی کہانیاں بڑی چاہ سے ڈھونڈتا اور بڑے شوق سے پڑھتا۔ اس کے کردار نہ تو فرشتہ سیرت تھے، نہ ہی وہ کسی کو شیطان کہتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے بہت زیادہ پسند ہونے کے باوجود قنوطیت پسند لگا۔

میں اُسے ہمیشہ ایک مکمل کہانی کار سمجھتا تھا اور اُسے ہمیشہ افسانے کی مبہم حدوں سے باہر رکھا۔ میرے نابالغ ذہن میں یہ نقشہ خود بخود بنا اور کسی بڑی تبدیلی کے بنا آج

تک قائم چلا آ رہا ہے۔

اس زمانے میں اکثر حیدرآباد جانے کا سبب بنتا تھا۔ فوجداری روڈ پر کتابوں کی دکانوں پر کئی روسی شہ پارے حیرت ناک حد تک سستے داموں مل جاتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے حیدرآباد بہت پسند تھا۔

روسی ادب سے واقفیت کا ایک ذریعہ سعادت حسن منٹو کا مرتب کردہ ''ہمایوں'' کا ''روسی ادب نمبر'' تھا۔ لاڑکانہ میں ترقیِ اردو ادب کی لائبریری میں شولوخوف کی ناولوں کے اردو ترجمے تو پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ دوستوئیفسکی کی ناولوں نے تو دھوم مچا دی تھی۔ اُف کیا طاقت تھی اُس کے قلم میں! اُس کے کردار جیسے خوردبین تلے رکھے ہوئے ہوں۔ ترگنیف (Ivan Turgnev) کا اثر تب سے چلا آ رہا ہے۔

نوجوانی کے دنوں میں فرانز کافکا اور کامیو مطالعے کی لسٹ پر نمایاں رہے۔ مگر یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ ان سے واقفیت ان کے فکشن کے ذریعے نہیں ہوئی، بلکہ کافکا کے خطوط اور کامیو کے مضامین تھے جنھوں نے متوجہ کیا۔ یہ وہی دورانیہ تھا جب ہم مادہ پرستی (Materialism) کے باعث کسی حد تک انقلابی رومان انگیزی میں مبتلا تھے۔ شاید اس کی وجہ چی گویرا کی معصومہ بین الاقوامیت تھی۔ اس کی شہادت اور Regis Debray کو بولیویا کے فوجی کورٹ سے ہونے والی سزا کے عمل نے ہمیں پوری طرح متاثر کیا تھا۔

یہ وہی زمانہ تھا جب امریکی سامراج کو کم زور اور مفلوک الحال ویت نامیوں نے سخت زچ کیا تھا۔ ان کی سرزمین کے ہر اک انچ پر ٹنوں کے حساب سے گولہ بارود پھینکا گیا، مگر وہ بڑی جی داری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔

جارحیت کو جب اطاعت، عاجزی اور محتاجی نہیں ملتی ہے تو وہ تلملا اٹھتی ہے۔ یہ مشاہدہ ہم نے اپنے پورے ہوش و حواس میں کیا۔ ویسے تو Mai lai کا قتلِ عام اتنی طویل جنگ میں ایک معمولی واقعہ تھا۔ مگر جب میڈیا نے اس پر سے پردہ ہٹایا تو ساری دنیا کانپ اٹھی۔ ''لائف'' میگزین میں اس قتل و غارت کی تصاویر ہم نے بھی دیکھیں، معصوم بچوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیے گئے تھے۔ وہ اپنی ماؤں کی بانہوں میں موت کی

سرزمین سے کئی سوال کرتے دکھائی دیے۔ ان معصوم سوالوں نے خود امریکی سماج کی اخلاقی بنیادوں کو بھی ہلا ڈالا تھا۔ بربریت کی وہ تصویریں، اپنی مظلومیت کی انتہا کو پہنچنے کے باوجود اک عجیب یقین اور عزم کا اظہار تھیں۔ ہم نے طاقت ور کی چودھراہٹ کے منہ پر پڑنے والا یہ طمانچہ بھی دیکھا۔ اسی طرح ساری دنیا اس جارحیت کے خلاف احتجاج کر رہی تھی لیکن سارتر نے جس اپنائیت کے ساتھ آواز بلند کی، وہ ہمارے لیے بے حد متاثر کن تھی۔ ہمیں اپنی نوجوانی میں ایک ہیرو مل گیا۔ الجزائری انقلابیوں کے لیے اس کی کوششیں ادب کا حصہ ہیں۔

یہ ذکر ختم ہونے والا نہیں۔ مطالعے کی اہمیت اور لطف کا بیان سمندر کی لامتناہی لہروں کے مختلف زاویوں کا حال بتانے کے برابر ہے جو کہ ایک لامحدود سلسلہ ہوگا۔ آج مطالعے کا رجحان ختم ہونے کی شکایت ہمہ وقت سنائی دیتی ہے، لیکن دراصل دنیا میں مطالعے کی عادت بڑھی ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس عمل نے پاکستانی سماج میں اپنی جڑیں اتنی مضبوط نہیں کیں۔ دنیاداری کے عروج پر پہنچ جانے کی وجہ سے علم کی بے قدری کا چلن عام ہے۔ کوئی زمانہ تھا جب ہمارے ہاں بھی ادیب کو تکریم دی جاتی تھی، ہر شخص کتاب کی اہمیت کا قائل تھا۔ قلم کا رتبہ بلند تھا۔ لکھت اور پڑھت کا ایسا تعلق قائم ہو چکا تھا کہ ادیب کبھی بکھرے بالوں کے ساتھ کافی ہاؤس میں خیالوں میں ڈوبا نظر پڑتا، تو کبھی بحث کی الجھی گتھیاں سلجھاتا ملتا تھا۔ اکثر اس کے ہاتھوں میں قلم اور کتابیں ہوتیں۔

آج کے منظرنامے میں ہم نے جانے پہچانے شخص کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھما دی ہے، حالاں کہ اس کی قمیص اور پتلون میں کئی جیبیں ہوتی ہیں۔ بہرحال اس رویے کو سماجی ردِعمل کا نتیجہ کہنا چاہیے۔ اگر علم اور قلم کی تعظیم ہوتی تو لوگ دنیاوی شان و شوکت کی نمائش کرتے کیوں دکھائی دیتے۔ جس شے کی ضرورت ہوگی، اُسی کا بندوبست کیا جائے گا۔ یہ طلب اور رسد کا سیدھا سادہ قانون ہے، اس سلسلے میں شکایت کاہے کی۔ یہ سماج کی تصویر ہے۔ باقی دنیاداروں پر منحصر ہے کہ وہ امرا کے جوتے سنبھالیں یا پھر اہلِ علم کی صحبت سے بہرہ مندہ ہوں۔

مشرقی سماج کا مزاج شاعرانہ ہے۔ یہاں ہر دور میں قابلِ ذکر شاعر جنم لیتے رہے اور تمام عمر شاعری کا جادو جگاتے رہے۔ شاعروں کی بڑی عزت ہے اور ہمیشہ سے ان کا مقام عوام اور خواص میں بلند رہا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شاعری کے زیور بے خودی و مجذوبیت ہیں اور شاعری کی بنیاد الوہیت پر استوار ہے۔ شاید اسی لیے ہمارے ہاں ہزاروں شاعر ہونے کے باوجود مطالعے کے شوق کو یک گونہ فروغ حاصل نہ ہوسکا۔ اس لیے کہ ہر کوئی کشف و جذب میں ڈوبا رہا اور ہوش آنے پر اپنے بے بہا اشعار گنگناتا رہا۔ کسی کے پاس دوسروں کی کتابیں پڑھنے کا وقت ہی کہاں تھا۔

علم سے اس دُوری کا سبب یہ رہا کہ ہمارے علمائے کرام نے اکتسابی علم کا حصول عیب سمجھا۔ منطق اور فلسفے کو مذہب سے متصادم خیال کیا جانے لگا تھا، اسی وجہ سے معتبر ہستیوں کے واسطے علم کے قریب سے گزرنا بھی جیسے کوئی گناہ تھا۔ پھر اگر غلطی سے کوئی کتاب پڑھ ہی لی اور کتاب کے مندرجات کے قائل بھی ہوگئے تو ان خیالات کا پرچار کرتے ہوئے، یہ انکشاف کرنے سے گریزاں رہے کہ یہ بات کس کتاب یا ذریعے سے ان تک پہنچی۔ جب علم اور کتاب کے ساتھ ایسا معاندانہ رویہ عام ہو تو پھر اس سماج کی علمی بے قدری کا مزید کیا شکوہ کیا جائے۔

امریکی ناول "Gone with the Wind" کی اشاعت کے پہلے روز پچاس ہزار کاپیاں فروخت ہوئیں۔ چھ ماہ میں یہ تعداد پندرہ لاکھ تک پہنچ گئی۔ ایسا صرف کسی ایک ناول کے ساتھ نہیں ہوا تھا، یہ روش علم و ادب کی ہر صنف کے ساتھ برتی جاتی ہے۔ بلاشبہ ایسے سماج حق رکھتے ہیں کہ ان کا احترام کیا جائے۔

ادب کے انسانی زندگی پر جو اثرات ہیں، تاریخِ عالم سے ان کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ والٹیئر اور روسو کو انقلابِ فرانس کا پیشوا مانا جاتا ہے۔ اسی طرح امریکی انقلاب کے حوالے سے ''کامن سینس'' جیسی کتاب کا اثر بھی مسلّم ہے۔ لیکن کیا ادب ہمارے یہاں بھی انقلاب برپا کرسکتا ہے؟

ممکن ہے کہ ہمارے کچھ شدید رومان پرست دوستوں کو ایسا گمان ہو۔ تاہم ہم

ایسی کسی بھی خام خیالی میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی عوامی شاعر کے کچھ ابیات، انقلابی جلسوں میں پڑھے جائیں اور جلوسوں میں گائے جائیں۔ لیکن ایسے کلام کو سمجھنے کے لیے بھوک اور مفلسی کے ساتھ ساتھ بنیادی تعلیم کی بھی حقیقی ضرورت ہے۔ جس سماج میں خواندگی کی شرح قریباً تیرہ فی صد ہو، جن میں سے صرف ایک فی صد رسائل یا اخبارت پڑھ سکتے ہوں، اور لاکھ میں سے محض دس افراد کوئی کتاب مکمل پڑھتے ہوں، تو پھر یہاں رسالوں، کتابوں اور صحیفوں کے اوراق پر طبع شدہ الفاظ خوب صورت تو ہوسکتے ہیں، مگر انقلاب برپا نہیں کرسکتے۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر لکھا ہوا لفظ انقلاب بھی نہیں لاسکتا اور کسی تبدیلی کا موجب بھی نہیں بن سکتا تو پھر ہم لکھتے کیوں ہیں؟

دیگر کئی پہلوؤں کے علاوہ ادب کا ایک فرض یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ایسی بلندیوں کی نشان دہی کرے جہاں تک انسان کی رسائی ممکن ہے۔ اسی طرح دوسری چھوٹی بڑی باتوں کے علاوہ لکھت کا اک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اس خلا کا عکس وضاحت کے ساتھ سامنے لائیں جس کی وجہ سے ہمارے سماج کے لوگ بلندیوں تک پہنچنے سے محروم رہے۔

یہ نہایت افسوس ناک امر ہے کہ یہ سماج شکست خوردہ ہے۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ سماج کو یہ شکست لوگوں نے خود دی ہے۔ اس معاملے میں کوئی بھی بیرونی شخص ایسا خطاکار نہیں اور نہ ہی ایسی کوئی اجنبی قوت ہے، جسے ہم موردِ الزام ٹھہرا سکیں۔ اگرچہ یہ فیشن عام ہے کہ ہم اپنی ہر کوتاہی، ہر غفلت اور ہر نقصان کسی نہ کسی کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ ''سی آئی اے'' کی طرف سے تو آج کل جاں بخشی لگتی ہے، کیوں کہ ان دنوں صرف ''را'' یا ''خاد'' کا نام لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر چند اجتماعی غلط کاریوں کی نشان دہی کرتے ہوئے یوں کہا جائے کہ ہم پر ہرگز براہِ راست امریکی دباؤ نہیں ہے کہ ہم شادیوں کے مواقع پر فضول خرچی کریں، نہ ہی ہم پر بھارتی دباؤ ہے کہ ہم تعلیم کو عام نہ کریں، اور نہ ہی افغانستان سے کوئی ہماری طرف رُخ کرکے دُعائیں پھونک رہا ہے کہ ہم اپنی حد

سے بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کو نظر انداز کریں اور بلا سوچے سمجھے مخلوقِ خدا بڑھاتے رہیں۔ کیا فرانس کی حکومت کو شوق ہے کہ ہم ہر آئے گئے کو زبردستی چائے پلا کر نہ صرف اپنی میزبانی کی قدیم روایت کو شرمندہ کریں بلکہ چائے کی پتی اور خشک دودھ کی درآمد پر زرِ کثیر خرچ کریں۔

سماج کی ان کم زوریوں کے علاوہ جب انفرادی سطح پر دیکھا جائے تو ہمیں کئی چھوٹی بڑی خامیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان عیوب اور خامیوں کو اتفاقیہ یا وقتی اخلاقی کم زوری کہہ کر مولوی صاحب اپنے پُرزور خطبے والی نشست کا مرکزی موضوعِ سخن قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح کچھ پہلوؤں کو اپنی فراست کے مطابق اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ایسی کوششوں کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ بھلا دوسرا ایسا کون سا ذریعہ ہے جس سے معاملات سلجھیں اور خیال آرائی کی راہ ہموار ہو۔

علاوہ ازیں یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ادب کا حسن سے واسطہ خواہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو، اس کی اصل بنیاد زندگی پر ہے۔ سو زندگی جیسے موضوع پر گفتگو کرنے کو ہر کوئی، ہر دم تیار ملے گا۔ کیوں کہ اس کے نتیجے میں دل چسپ اور اکثر حسین باتیں کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ایسے مواقع پر اکثر عجب کاریاں ہوتی ہیں۔ سوچ بچار کی نئی راہیں کھل جاتی ہیں، نئی جہتوں کا تعین ہو پاتا ہے۔ شاید لکھت کے اسی وصف کے سبب تحریر کے حسن کے متوالے لکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ادیب کسی تعریف و توصیف کی طمع میں لکھتا ہے، یہ محض خام خیالی ہے۔ لفظوں کی بُنت، مہارت اور مشاہدے کا جو تعلق ہے، اس کی تدریس ممکن ہی نہیں۔ انسانی خیالات کسی دھندلے شیشے پر اَن گنت اشیا کے پڑنے والے عکس کی طرح ہیں۔ ان میں چند صورتیں دیدہ تو کئی نادیدہ ہوتی ہیں۔ خیالات کی اتنی ساری بلاؤں کا سامنا کرتے ہوئے، معاملات کو قابلِ فہم صورت عطا کرنے سے ادیب کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اس کی لفظی مصوری کی دھاک بیٹھ جائے۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ انسانی عمل کے محرکات کی تفہیم کی کوئی راہ نکل آئے اور سماج کے کردار پر گفت و شنید کی رسم چل نکلے۔ ویسے بھی انسانی کردار کا سب سے واشگاف مطالعہ ادب کو ہی قرار دیا گیا ہے۔

مشہور جاپانی ادیب یوکیومشیما کو ایک نقاد نے سخت طیش کے عالم میں مشورہ دیا کہ وہ کسی نفسیاتی ماہر سے رجوع کرے۔ جس پر یوکیومشیما نے کہا تھا کہ نفسیات دان اپنے سائیکو اینالیسس کے لیے ادیبوں کے پاس جائیں تاکہ انھیں اپنی ذہنی کیفیت سمجھنے اور سوچ درست کرنے کا اچھا موقع مل سکے۔

ادیب مشاہدے کو اپنے تصورات میں گوندھ کر خیالات کی بھٹی میں پگھلا کر کرداروں کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ یہ کردار زندگی میں برتے جانے والے انسانی عمل کے ہر پہلو سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نیکوکار ہوتے ہیں اور بدکردار بھی۔ لیکن جیسا کہ ایسے کردار ادیب کے تخلیقی عمل کا حصہ ہوتے ہیں، اس لیے اسے ان کرداروں سے ہمدردی ہوتی ہے۔ ہمدردی ایک ایسی قوت ہے جس کی بدولت شاہکار تخلیق ہو سکتے ہیں۔

ادب کے اسباب اور مقاصد کے بارے میں ہر دور میں خیال آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ عالموں اور ادیبوں نے اس ضمن میں بے شمار اغراض اور اسباب بتائے ہیں۔ ادب کے مقام کے تعیّن کے بارے میں بھی نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔ بہرحال ادب کا کوئی بھی نصب العین ہو اور ہمارے پاس اس کا جو بھی درجہ ہو، ان تمام باتوں سے قطعِ نظر کہ ادب سماج پر اثرانداز ہوتا ہے یا نہیں— یہ بالکل یقینی ہے کہ ادب سماج سے متاثر ہوتا ہے۔ کئی بالغ نظر نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ادب سماج کے کچھ طبقات کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ چند خاص طبقوں کی ثنا کرتا ہے تو چند مخصوص طبقوں کے شکوے شکایتیں۔

ایک حد تک ہم ایسی سخت تنقید کو بھی قبول کرتے ہیں مگر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ادیب جو بات کرتا ہے، وہ اس کے مشاہدات اور تصورات پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب وہ قلم اٹھاتا ہے تو اس کے خیالات یا عقیدے خواہ دوسروں سے الگ ہوں، مگر وہ ان کا اظہار شائستگی کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر رُخ پر روشنی ڈالتا ہے۔ معاشرے کی بہت ساری کیفیتوں کی وضاحت پیش کرتا ہے اور دنیا کے سارے رنگوں کی رنگینیوں کو اُجاگر کرتا ہے۔

اسی طرح افسانوی ادب اپنے حصے کی ذمے داریاں نبھا رہا ہے اور مختلف انسانی

کیفیات کی مختصر داستانیں سناتا جاتا ہے۔ ان کیفیتوں میں معاشی تضادات کی جھلک بھی ہے تو ذاتی پسند و ناپسند کے غیر ضروری ہچکولے بھی ہیں۔ یہاں پیداواری طریقوں کی تبدیلیوں کی وجہ سے آنے والے جھٹکے ہیں تو دلوں کی ستائش کا قرار بھی ہے۔ قربت کی دل کش چاندنی ہے تو تنہائی کی اندھیری رات بھی ہے۔ یہاں اداسی کی کوک کوکتی ہے تو رشتوں کے ملاپ کے راگ بھی گونجتے ہیں۔ افسانے کے دامن میں اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔

خود فرد کے اپنے اندر ہر گھڑی جنم لیتے تضادات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ میں جلاد کی تلوار کا نشانہ بن کر، ظالم کے ظلم کا مارا ہوا ہوں، دشمن کے زہر کا شکار بنوں یا بدمعاش اور مکار کے فریب میں پھنس جاؤں۔ یہ صورتِ حال نہایت آسان ہے۔ اس کی وضاحت نہایت آسانی سے اور بہت اچھی طرح سے کی جاسکتی ہے۔ ظالم کو موردِ الزام ٹھہرا دو، قاتل کے مجرمانہ کردار کا تذکرہ کرو۔ مکار کی فریب کاری ظاہر کردو، اس طرح سے واویلا کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

مگر اس صورت میں کیا کیا جائے جب فرد خود اپنے تضادات کے ہاتھوں شکار ہوا ہو۔ اس صورت میں دوش دیا جائے تو کس کو، فریاد کی جائے تو کس سے، انصاف مانگا جائے تو کس سے؟

پیارے وطن میں جب مارشل لا لگا تو اس کا رنگ روپ ہی نرالا تھا۔ جبر کی کیا بات کی جائے۔ یوں بھی زمانہ جانتا ہے اور ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ جابر کی لاٹھی دو رُخی ہوتی ہے جس طرف سے بھی پڑے، کاری ضرب آوے۔ جبر پر صبر، تشدد پر چپ— معاملہ بڑھتا ہی گیا۔ لوگ ظلم سہ سہ کر عاجز آگئے۔ جب بالکل تنگ آگئے تو پھر زمانے نے دیکھا کہ کیا کچھ نہ ہوا۔ پہلے تو شہری لوگ اپنی کم یا زیادہ تعلیم کی وجہ سے رہنما بن کھڑے ہوتے تھے۔ وہی سیاسی کارکن تھے اور تحریکوں کے پہیے بھی وہی تھے۔ لیکن پھر تعلیم سے محروم دیہاتی عوام بھی میدان میں نکل آئے۔ تعلیم کی کمی اور سیاسی رہبری کی عدم موجودگی پیروں کی بیڑی بن گئی ورنہ یہ تحریک صدیوں کا فاصلہ طے کرلیتی۔ عوام کے عمل اور عوامی حمایت کی اہمیت کا بھرپور اندازہ کرتے ہوئے اربابِ اختیار نے نئے سرے سے منصوبہ بندی

کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ریاستی جبر نے اپنے چہرے پر نقاب چڑھالی۔ نئے ہتھیار سنبھالے، نئے جلاد بھرتی کیے اور نئے نصاب پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ جیلیں توڑ دی گئیں، سزائے موت کے قیدی فرار ہوگئے۔ حکومتی مشینری پیچھے پیچھے تھی اور معصوم لوگ آگے آگے، موت تعاقب میں تھی اور زندگی سامنے بلا رہی تھی۔ تہی دست، خوف زدہ لوگ بکریوں سے بدتر اور بھیڑوں سے زیادہ بھولے، مگر جب وہی لوگ کسی ترتیب یا ضابطے میں تھے تو بے حد طاقت ور اور مضبوط ہوسکتے تھے۔ لوگوں کی خواہش کے مطابق سیاسی پارٹیوں پر بھی مصالحتی رویے ترک کرکے مقابلہ کرنے کے لیے شدید دباؤ تھا۔ لہٰذا ان کا وجود بھی ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ آمروں کی نیندیں اُڑا رہا تھا۔ ان کا کوئی مناسب بندوبست ہونا چاہیے، تعصبات کی آگ کو ہوا دینا مناسب سمجھا گیا۔ فرقہ واریت کا نعرہ عوامی یکجہتی کے مضبوط رویوں کو تہس نہس کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

معاشرے میں موجود چھوٹے بڑے تضادات کے سائے پھیل کر بڑے ہوگئے۔ اس حد تک بڑے ہوگئے کہ معصوم شہری ان کو دیکھ کر سہم گئے۔ اس عمل میں کچھ معمولی سطح کے لوگوں کی پرچھائیاں بھی پھیل گئیں۔ یہ پرچھائیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ لوگ خود اپنی ہی فریب نظری کا شکار ہوگئے۔ اس دھوکے میں مات کھانے والوں نے دوسروں کو ہلاک کرنا شروع کردیا۔ یہ وہ عمومی منظر تھا جب اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ آسمان سرخ ہوگیا اور منظر یکسر بدل گیا۔ پھر نئے سرے سے جمہوری تجربات کا کھیل شروع ہوگیا۔

ان تبدیلیوں سے ادب کو بھی مسلسل متاثر ہونا چاہیے تھا۔ مگر یہ اک دل چسپ حقیقت ہے کہ اردو حتیٰ کہ سندھی ادب نے بھی اسّی کی دہائی کے حالات سے کم اثر لیا۔ اسی وجہ سے ادبی تخلیق اور سیاسی تغیرات کا پرتو مشکل سے دکھائی دیا۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سماج کی اس ٹوٹ پھوٹ میں وہ متوسط (اور نچلا متوسط) طبقہ تھا جس کو قابلِ ذکر جھٹکا لگا ہو۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ لکھت والا قلم بھی اسی طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سماجی تبدیلی کی کوئی تصویر خال خال ہی نظر آئی۔ ماسوائے کسی غیر اہم رسالے میں اشاعت شدہ کسی بے توجہ افسانے کی صورت میں۔

پھر جب دانستہ پیدا کیے گئے تضادات اور بھڑکائی گئی مخالفتوں کا منفی ردِعمل شروع ہوا تو یہ طبقہ خاص متاثرین میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا عکس ادبی کاوشوں میں معقول حد تک نظر آتا ہے۔

ہمارا سماج مختلف واقعات، حادثات اور تاریخی عمل سے گزرتے ہوئے، اوج اور بربادی کی کئی گردشیں کاٹ چکا ہے۔ اور آج جس صورتِ حال سے نبرد آزما ہے، وہ اس کا آج کی دنیا میں گھٹنوں کے بل رینگنے کا عمل کہا جاسکتا ہے۔ اس بچپنے میں اس پر نہ تو لکھنے پڑھنے کی ذمے داری ہے اور نہ ہی یہ کمانے یا پرورش کرنے کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ ہی اسے کسی قابلِ ذکر پیداواری عمل سے وابستہ دیکھتے ہیں۔ جیسے کوئی ننھا معصوم بچہ ہوتا ہے، جسے نفع کی خبر ہوتی ہے نہ نقصان کا ہوش۔ وہ جو بھی قدم اٹھاتا ہے، ٹھوکر کھاتا ہے، جس شے کو بھی ہاتھ لگاتا ہے، توڑ کر دور پھینک دیتا ہے۔ اس کے باوجود بے خبر ہوتا ہے اور معصوم رہتا ہے۔

سو آج کل جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بچپنے کے عمومی مزاج کے مطابق ہے۔ یوں زندگی رواں دواں ہے اور ادب کسی حد تک اس کے مختلف رویوں کا مطالعہ پیش کرتا رہتا ہے۔

کلیم لاشاری

عرضِ مترجم

ڈاکٹر کلیم لاشاری جی سے میرا تعارف ان کی کہانیوں تک محدود ہے۔ گزشتہ برسوں کے دوران مجھے سندھی کہانی کو پڑھنے کا موقع ملا تو بعض خیرخواہوں نے ترجمے کی تحریک دی۔ جب میں نے سندھی کہانیوں کو اردو ادب کے قارئین تک پہنچانے کا آغاز کیا تو کرم فرماؤں نے میری کاوشوں کو سراہا اور مجھے حوصلہ دیا۔ ان دنوں مسلسل قرأت اور تراجم کرتے ہوئے مجھے کلیم لاشاری کی کہانیوں نے بطورِ خاص متوجہ کیا۔ میں نے ان کی بیشتر کہانیوں کو اپنے ترجیحی مطالعے کے قریب تر ہونے کے سبب بار بار قرأت کیا۔

میں سمجھتا ہوں، ان کہانیوں کے کردار صرف سندھ دھرتی پر ہی سانس نہیں لیتے بلکہ ہر خطے میں جیتے مرتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ بلاشبہ ہر زمانے کا ادب اپنے عہد کی تاریخ ہوتا ہے۔ زیرِ نظر کہانیاں ترجمہ کرتے وقت میں قلبی سرشاری کے بجائے ذہنی کرب سے دوچار رہا۔ مجھے افسوس صد افسوس ہے کہ میں نے جس صدی میں جنم لیا اور جو صدی مجھے عملی طور پر زندگی کرنے کو ملی، اس کا بیشتر حصہ میرے وطن نے نگہبانوں کی یرغمالی بھگتی۔ میں سمجھتا ہوں تاوان میں ملک اور قوم کا بہت سا وقت دیا جاچکا ہے لیکن رہائی ہنوز نصیب نہیں ہوئی۔ جس طرح کلیم لاشاری کے کردار کسی نہ کسی بہروپ میں آزادی، انصاف، خودارادیت اور روشنی کے لیے جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں، بالکل اسی طرح میں دل برداشتہ ہونے کے باوجود مایوس نہیں ہوا۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آخر اک روز اجالے

کی کرنیں نور بکھیریں گی۔ ہر گزرتی گھڑی فاصلہ کم کیے جاتی ہے۔

ترجمے کے دوران مجھے اپنی پیر و مرشد زاہدہ حنا کی راہ نمائی اور معاونت نصیب رہی۔ میں اپنی اس خوش بختی پہ مولا سائیں کا شکر گزار ہوں، بے حد شکر گزار۔

شاہد حنائی

اُنّیس سو ترا سی

بارش کی وجہ سے موسم نکھر گیا ہے۔

لطیف کار ڈرائیو کرتے ہوئے سوچتا رہا۔ وہ شارعِ فیصل پر سیدھا جا رہا تھا۔ ایئرپورٹ کی ڈھلوان پر سگنل بند ملا۔ وہ اطمینان کے ساتھ رُک گیا۔ اسے کوئی عجلت نہیں تھی۔ ویسے بھی سفر طویل تھا، ملیر سے گزرنے کے بعد نئی سڑک اچھی لگی۔ کافی عرصے پہلے جب وہ اس سڑک سے گزرا رہا تھا تو اس وقت ایسی صفائی نہیں تھی اور سڑک کشادہ بھی نہیں تھی۔ وہ یاد کرنے لگا کہ آخری دفعہ کب گیا تھا۔ زیادہ تر سپر ہائی وے سے کراچی جانا ہوتا تھا۔ آج ٹھٹھہ میں ایک دوست سے ملنا مقصود تھا، اس لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ سروس جوائن کرنے کے بعد فرصت ہی کم ملتی تھی۔ پہلے تو وہ یارانوں کا دلدادہ تھا۔ وہ گپ شپ تو اب خواب میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ادبی بحثیں، پکنکیں، نہر پر نہانے کی تیاریاں، دوستوں کی بیٹھکوں میں شامیں۔ اب تو صرف یادیں ہی رہ گئی تھیں، کبھی کبھی وہ سوچتا، کیا ایسا ممکن ہے کہ وہ سب پھر سے مل بیٹھیں اور وہی محفلیں آباد ہو جائیں۔ اس کی ملازمت کچھ ایسی تھی کہ عید بقرعید پر بھی چھٹی نہ کر سکتا تھا۔ پھر یہ کہ اب اس کا گھر آبائی شہر میں نہیں تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد اس شہر سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ جہاں پوسٹنگ ہوتی، وہیں گھر ہوتا۔

جب کبھی اس کا تبادلہ کسی ایسے شہر میں ہوتا جہاں اس کا کوئی پرانا کلاس فیلو مقیم

ہوتا تو وہ دورانیہ عجب خوشی اور سرمستی میں بسر ہوتا، پھر کبھی کبھار اک دو روز کے لیے کوئی دوست ملنے آجاتا تو یہ وقت اور خوش گوار گزرتا۔ وگرنہ تو صرف جب دوستوں کے خطوط لے کر کسی کام کی غرض سے آنے والے پہنچتے تو اسے یہ کام کرتے ہوئے لطف آتا تھا۔ پھر فون پر دوستوں سے گفت وشنید کر کے کسر نکالی جاتی۔

سہیل سے فون پر بات چیت ہوتی تھی۔ لطیف نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ٹھٹھہ شہر آئے گا اور سہیل کے ہاں رات ٹھہرے گا۔

''ہاں، ہاں!''

ہارن کی تیز آواز نے احساس دلایا کہ عقب سے آنے والی کار اوور ٹیک کرنا چاہتی ہے، اس نے سائیڈ مرر میں دیکھا کہ سفید اکارڈ میں سوار شخص جلدی میں تھا۔ لطیف نے اپنی گاڑی کو سائیڈ پر کیا، اکارڈ تیزی سے گزر گئی۔

سامنے روڈ پر ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ سے اکارڈ کو لفٹ کا اشارہ کیا مگر اکارڈ اسی رفتار سے گزر گئی۔ لطیف نے گردن کو خم دیا اور لڑکے کے نزدیک پہنچ کر بریک لگا دی۔ نوجوان جو خاکی پتلون اور سفید اسپورٹس شرٹ میں ملبوس تھا، اس نے نیچے رکھے سفری بیگ کو اٹھا لیا۔ لطیف نے دروازہ کھولا، لڑکے نے جھٹکے کے ساتھ اپنا بیگ پچھلی سیٹ پر پھینکا اور ''تھینک یو'' کہتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ اس کے سر پر ہیٹ نما ٹوپی تھی جو قدرے میلی ہو رہی تھی۔ ٹوپی اتارتے ہوئے لڑکے نے کہا، ''آئی ایم گوئنگ ٹو مکلی سر۔''

لڑکے کی یہ بات لطیف کو واپس نیشنل ہائی وے پر لے آئی۔ اس نے گردن کو جنبش دے کر ''ویلکم'' کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ لطیف نے نوجوان کا جائزہ لیا۔ وہ غیر ملکی تھا، اس کے کپڑے اور جوتے باہر کے تھے، رنگ روپ اور تیکھی ناک نارمن ہونے کی چغلی کھا رہی تھی، آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں۔ کیا وہ یونانی تھا؟ اس کی جلد شفاف تھی، شاید وہ اٹلی یا ترکی سے تعلق رکھتا ہو— لیکن اس کا مسکراتا ہوا زیریں لب کسی شریر سندھی بچے جیسا تھا۔

لطیف نے گردن موڑتے ہوئے قیافہ شناسی میں اپنی بے خبری کا اعتراف کیا

اور شائستگی کے ساتھ پوچھا، ''مے آئی ہیو پریویلج ٹو نو یو سر؟''

''مائی نیم از علی۔'' لڑکے کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی، گویا اسے پورا یقین تھا کہ اس کے لفظوں کا کیا اثر ہوگا۔ ''آئے لیو اِن کیمبرج۔'' وہ لطیف کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھتا رہا۔

''آئی ایم لطیف— ہاؤ ڈو یو ڈو سر۔'' لطیف نے جلدی سے کہا۔

علی اس کے تکلف پر دوبارہ مسکرا دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لطیف کے ذہن میں جمع ہونے والے سوالات کی کثرت کے باعث پیدا ہونے والی پریشانی کو اچھی طرح سمجھ رہا ہو۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ برس میں ہوگی۔ قامت درمیانہ، موزوں جسامت، تراشیدہ بال، بھیگتی ہوئی مسیں، پُرتجسس آنکھوں میں ہوشیاری نمایاں، کشادہ پیشانی، چھوٹا چہرہ، سرخ ہونٹ، نچلا ہونٹ ذرا موٹا جس پر مسکراہٹ رقصاں تھیں۔

لطیف نے علی کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اب ذہن میں سوال ترتیب دے چکا تھا۔ اسے علی کے چہرے پر کسی عجیب بات کا احساس ہوا تھا۔ کوئی ایسی بات جسے وہ بیان نہیں کرسکتا تھا۔ ''ہاؤ کم یو ور دیئر ان دی وائلڈرنیس؟'' اس نے بے تکلف لہجے میں سوال کیا۔

علی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی، ''آئی نو سندھی! اِف یو پلیز، وی کین ٹاک اِن اٹ۔'' اس نے کہا۔

لطیف کے چہرے پر حیرت کا ایک بڑا نشان نظر آیا۔ وہ ہنسنے لگا، اس کی ہنسی میں خوشی اور بے یقینی دونوں شامل تھیں۔

''میں چوکنڈی کی قبریں دیکھنے آیا تھا۔ علی نے آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا، گو دوبارہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ جس زبان کو وہ سندھی سمجھتا رہا ہے، وہ واقعی سندھی ہی ہے۔ اس کے الفاظ واضح اور لہجہ صاف تھا۔ البتہ اسے بولنے میں قدرے جھجک ہو رہی تھی۔ لطیف کے چہرے پر خوشی کے باعث سرخی پھیل گئی۔ اس نے علی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''ہاں! ہاں بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک!'' جیسے وہ نہ صرف علی کی حوصلہ افزائی کر رہا

ہو بلکہ خود اپنے آپ کو بھی یقین دلا رہا ہو۔ اس کی عمر پینتیس سال کی ہوگی، وہ اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ اپنے دوستوں کے حلقے میں وہ ایک سمجھ دار اور پُرخلوص دوست مشہور تھا۔ اس کے افسرانِ بالا اس کی معاملہ فہمی کے قائل تھے، ایک دفعہ کام کے متعلق ہدایات ملنے کے بعد وہ کام کی نوعیت سے پوری طرح واقف ہوکر اس کام کو احسن طریقے سے نمٹا دیتا تھا۔ ماتحتوں کی اکثریت اس سے خوش رہتی تھی، کیوں کہ وہ ایمان دار ہوتے ہوئے بھی سخت مزاج نہ تھا اور دوستوں کی سفارش بلاوجہ رد نہیں کرتا تھا۔

لطیف نے اپنی مسرت مخفی رکھنے کی ذرا کوشش نہیں کی تھی، ''مجھے بہت خوشی ہوئی ہے لیکن میں آپ کے متعلق کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ برائے کرم آپ اپنا مکمل تعارف کرائیں۔''

''میرے والد صاحب سندھی ہیں، وہ کیمبرج میں فزکس پڑھاتے ہیں۔ میری والدہ بھی وہیں ہسٹری پڑھاتی ہیں، وہ آئرش ہیں۔ میں ان کے ساتھ کیمبرج میں ہی رہتا ہوں۔ کنگس کالج میں پڑھتا ہوں، فلسفہ میجر سبجیکٹ ہے۔'' علی نے اپنا تعارف کرایا۔ اب لطیف کے لیے سارا معاملہ سمجھنا مشکل نہ تھا۔ علی کے والد صاحب سندھی تھے۔ وہ تعلیم کی خاطر باہر گئے۔ وہیں سروس کی اور شادی بھی۔ علی انگلینڈ میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ اس کے والد صاحب نے سندھی سکھائی۔ اب تعطیلات میں وہ سندھ کا علاقے دیکھنے کے لیے آیا ہے اور اس وقت چوکنڈی☆ کا قبرستان دیکھ کر روڈ پر کھڑا تھا، جہاں ان دونوں کی ملاقات ہوگئی۔

لطیف مسرور تھا، اس احساس نے اسے تسکین دی کہ انگلینڈ میں ایک سندھی نے اپنے بیٹے کو اپنی مادری زبان سے روشناس کرایا۔ اس نے علی سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا، علی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''میں سول سرونٹ ہوں۔ کراچی میں ڈپٹی سیکریٹری تھا، اب ڈپٹی کمشنر کی

☆ چوکنڈی: سندھی میں چوکور یا چار کونوں والی چیز، عمارت، رقبے کو کہتے ہیں۔ کراچی کے مشرق میں ایک قبرستان میں ایسی قبریں موجود ہیں، غالباً اسی بنا پر اسے چوکنڈی قبرستان کہا جاتا ہے۔

پوسٹ پر ٹرانسفر ہوا ہوں۔'' لطیف نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بات آگے بڑھائی، ''ہاں تو آپ چوکنڈی کا قبرستان دیکھ آئے ہیں، آپ کو کوئی خاص بات نظر آئی؟'' لطیف نے محض گفتگو جاری رکھنے کی خاطر سوال کیا۔ اسے علی کا سندھی بولنا خوشی دے رہا تھا۔

علی کچھ دیر چپ رہا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی لمبی چوڑی تفصیل کے لیے ذہن میں الفاظ ترتیب دے رہا ہو۔

''کیا یہ قبریں بذاتِ خود خاص نہیں ہیں؟'' علی نے پوچھا۔ اب وہ گفتگو کے لیے مکمل طور پر تیار تھا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ ان قبروں میں دوسری کون سی خصوصیت ہے؟'' لطیف نے عجلت میں کہا، ''میں محض ایک دفعہ تھوڑی دیر کے لیے وہاں گیا تھا، مجھے ان قبروں کے بابت کچھ پتا نہیں ہے۔'' لطیف نے اپنے آپ کو بری کرنے کی کوشش کی۔ علی کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے چوکنڈی کے بارے میں کافی معلومات تھیں۔

علی، لطیف کے یوں جان چھڑانے پر مسکرایا۔ اسے یقین تھا کہ لطیف ایسا انجان نہیں تھا جیسا وہ خود کو ثابت کر رہا تھا۔

''سائیں چوکنڈی کی قبریں خوب صورت ہیں لیکن عجیب بھی۔'' علی نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔ جب تک میں مکلی کی قبریں اور مقابر نہ دیکھوں، تب تک یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکوں گا۔'' اس نے لطیف کی طرف دیکھا اور کہا، ''ایک بات بہرکیف کہی جاسکتی ہے کہ چوکنڈی کا پتھر کا کام اجمیر اور جودھ پور کے کام سے منفرد ہے۔''

لطیف نے حیرت کے ساتھ علی کی طرف دیکھا۔ علی مسکراتے ہوئے بولا، ''ہاں سائیں! اس بات میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہاں جیومیٹریکل پتھر ہیں اور بیکانیر، جودھ پور اور اجمیر میں فلورل ڈیزائن ملتے ہیں۔ صرف ایک بات مشترک ہے، وہ ہے پتھر کا رنگ۔'' علی نے سانس لیا، ''البتہ یہ پتھر مقامی ہے اور وہ سینڈ اسٹون اجمیر کا ہے۔''

لطیف نے ذہن پر زور دیا۔ علی ٹھیک کہہ رہا تھا، اسے چوکنڈی کی قبروں پر منقش

ڈیزائن اور شبیہیں یاد آنے لگیں، ''لیکن انسانی شکلوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟''

اچھی بات یاد دلائی۔ راجپوتانہ یادگاروں اور سنی اسٹون پر انسانی شبیہات جو ہندوستان میں دیکھی تھیں، وہ مختلف کیفیات ظاہر کرتی ہیں۔ وہ شکلیں خوب صورت بنائی گئی ہیں مگر یہاں جو دو چار جگہوں پر انسانی شکلیں موجود ہیں، وہ ویک ہیں اور ان پر کاری گر کا کنٹرول نہ ہونے کے برابر ہے، حالاں کہ دیگر ڈیزائن عمدگی کے ساتھ ابھارے گئے ہیں۔ اگر ابھار بہتر ہوتے تو پھر ہمیں یہ صورتیں زیادہ نمایاں دکھائی دیتیں، صاف اور مثالی ہوتیں۔''

''راستے میں بھی ایک دو مقامات پر چوکور قبریں ہیں۔'' لطیف نے بتایا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ اس قسم کی قبریں جیسی چوکنڈی کے قبرستان میں ہیں۔''

''ہاں ویسی ہی چوکور۔'' لطیف نے لفظ لفظ پر زور زور دیتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجیے گا، آپ شاید ایسی قبروں کو چوکنڈی (چوکور) کہتے ہیں۔ دراصل چار کونوں والے چبوترے اور اس پر بنائی گئی چھت کو چوکنڈی کہا جاتا ہے۔ اس لیے قبروں کے حوالے سے اس قبرستان کو چوکنڈی کہنا شروع کردیا گیا۔'' علی کے سنجیدہ چہرے پر اطمینان تھا۔ اسے یقین تھا کہ لطیف یہ بات سمجھ چکا ہے۔

لطیف نے گردن ہلائی۔ وہ سوچنے لگا، کیا علی اپنی عمر سے زیادہ نہیں جانتا؟

''اچھا! مکلی دیکھنے کے بعد آپ کو کن باتوں کا یقین ہوسکے گا؟'' لطیف نے علی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہ خود کو علی سے بے تکلف محسوس کرتا ہے۔

''چوکنڈی قبرستان کی جداگانہ حیثیت کے متعلق یقین ہوگا۔ یعنی یہ کہ یہاں کے مکین مکلی کے تہذیبی، تمدنی اثرات سے دور تھے۔ دوسرا میرا یہ خیال ہے کہ مکلی میں جودھ پوری اور اجمیری کاری گر کا ماہرانہ ہنر دیکھنے کو ملے گا۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو ایسے ثبوت دکھا سکوں گا۔'' علی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''ان شاء اللہ ہم پندرہ منٹ میں مکلی پہنچ جائیں گے۔'' لطیف نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا۔

''آپ کا مطلب ہے اگر کوئی وہیل پنکچر نہ ہوا، فین بیلٹ نہ ٹوٹا یا اس طرح کی

کوئی بات نہ ہوئی تو ہم پندرہ منٹ میں مکلی پہنچ جائیں گے؟'' علی نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

لطیف ہنس دیا، ''دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کر کے مکلی کے قبرستان چلیں گے، کیوں کہ دن کافی گرم ہے۔'' لطیف پروگرام بتانے لگا۔ علی اس کی طرف دیکھ رہا تھا، ''وہاں میرا دوست پولیس سپرنٹنڈنٹ ہے۔ میں نے اسے فون پر اپنی آمد کی اطلاع دے رکھی ہے، وہ انتظار...'' لطیف نے تفصیل سے بتانا شروع کیا لیکن اچانک کسی خیال سے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔

''آپ...'' اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ علی کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ وہ سمجھ گیا کہ لطیف کیا کہنا چاہ رہا ہے، اس نے فوراً اقرار میں گردن ہلانا شروع کردی، ''آپ ہمارے مہمان ہیں، امید ہے کہ ہمیں خدمت کا موقع دیں گے۔'' لطیف نے جملہ پورا کیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھا، ''آپ کا کیا پروگرام ہے؟ آپ واپس کراچی جائیں گے؟''

''نہیں، میں مکلی کے بعد حیدرآباد جانا چاہتا ہوں۔ وہاں سے موئن جو دڑو جاؤں گا۔'' علی نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ جواب دیا۔

''ہوں!'' لطیف کے چہرے پر فکرمندی کے سائے پھیل گئے، اس نے طویل سانس لیا۔ علی اس کے چہرے پر بدلتے تاثرات دیکھ کر چپ ہوگیا۔

''سائیں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' قدرے توقف کے بعد اس نے فکرمندانہ لہجے میں پوچھا، ''کیا؟ ہاں!'' لطیف نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا، ''اصل بات یہ ہے کہ اندرونِ سندھ کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، سیاسی تحریک چل رہی ہے۔ روز ہڑتالیں ہو رہی ہیں، شہروں میں آرمی گشت کر رہی ہے۔ میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ سندھ جانے کا پروگرام ملتوی کردیں۔''

علی سوچ میں پڑ گیا، اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نہیں تھے۔

''سائیں آپ درست کہہ رہے ہیں، لیکن اگر میں اس وقت سندھ دیکھنے کا پروگرام ملتوی کرتا ہوں تو پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ مجھے دوبارہ ایسا اچھا موقع اور فرصت مل

پائے۔ پھر موجودہ حالات میں مجھے زیادہ بہتر طور پر یہاں کے سیاسی و سماجی حالات دیکھنے کا موقع ملے گا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ہڑتال کی وجہ سے سفر میں دشواری پیش آئے گی۔'' اس کے ذہن میں کوئی خیال آیا اور چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے خوش دلی کے ساتھ کہا، ''لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے دریا دلوں کی سندھ میں کمی نہ ہوگی۔''

''بھائی میں حاضر ہوں، مجھے خود حیدرآباد، دادو، لاڑکانہ سے ہوکر جانا ہے۔ ہم اکٹھے چلیں گے۔ اللہ کرے گا کہ کوئی پریشانی نہ ہوگی۔'' لطیف نے جلدی سے جواب دیا۔

علی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے دُہرایا، ''اللہ کرے گا...'' اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا، ''سائیں! آپ کی مہربانی، لیکن میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ آپ اپنی ملازمت کے سلسلے میں جا رہے ہیں، آپ کو اپنے گھر بھی جانا ہوگا۔ آپ کو میری طرف سے اجازت ہے، میں ان کرم فرمائیوں کے لیے شکرگزار ہوں۔''

لطیف کو یقین ہوگیا کہ علی اپنا پروگرام ملتوی نہیں کرے گا، کیوں کہ اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ اس نے تعطیلات کا زیادہ تر وقت ہندوستان میں گزارا تھا، باقی محدود سا وقت بچ رہا تھا۔ اس کی کلاسیں شروع ہونے والی تھیں۔ لہٰذا اسے واپس انگلینڈ جانا تھا۔ وہ کوئی یہاں کا مکین تو نہ تھا کہ حالات بہتر ہونے کا انتظار کر سکے۔ اس صورتِ حال میں اپنی سرکاری حیثیت کی بدولت وہ اس کا اچھا رہبر بھی ثابت ہوسکتا تھا اور نگہبان بھی۔ علاوہ ازیں میزبانی کی سماجی روایت کی وجہ سے اسے علی کو تنہا چھوڑنا بھی گوارا نہیں تھا۔ نیز اس قدر قلیل دورانیے میں وہ علی سے ایسا مانوس ہوگیا تھا کہ اپنائیت کے طاقت ور احساس نے اس کے وجود کو گھیر لیا۔ پھر اپنی ذات اور تنہائی کے تصور نے بھی اداسی کی لہر اس کے ذہن کے افق پر سردیوں کی گھٹا کی طرح بکھیر دی تھی۔ یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں کسی ترتیب کے بغیر گردش کرنے لگیں۔ اس نے اپنا گلا صاف کرکے علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''میرے پاس جوائننگ پیریڈ کافی ہے، میں خود چھٹیوں میں وقت گزارنے کے لیے بہانے ڈھونڈتا ہوں۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا، ''میرا نہ کوئی گھر نہ بچے۔'' اس کی آواز مزید بھاری ہوگئی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی احساس کی شدت نے اسے رنجیدہ کر دیا تھا۔

علی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا، ''سائیں مجھے افسوس ہے کہ میرے کسی لفظ کی وجہ سے آپ کو وہ باتیں یاد آگئیں جنھیں آپ بھلانا چاہتے ہیں۔'' وہ اک لمحے کو چپ ہوگیا، ''کیا ٹھٹھہ میں رات رکنا ہے؟''

سہیل کے ساتھ پروگرام تو یہی طے پایا تھا۔'' لطیف نے جواب دیا۔

''چاندنی رات ہے، میں سمجھتا ہوں دنیا کا یہ بڑا قبرستان چاند کی روشنی میں دل چسپ نظارہ پیش کرے گا۔''

''ہاں رات کھانے کے بعد بھی مکلی کا چکر لگایا جاسکتا ہے۔'' لطیف کو علی کا خیال پسند آیا۔

علی کے چہرے پر مسکراہٹ عود کر آئی، وہ لطیف کو پرانی یادوں سے باہر کھینچ لایا تھا۔ سڑک کے کنارے پر کھڑے ایک دیہاتی شخص نے انھیں اشارے سے کھمبیاں☆ دکھائیں جو بیچنے کے لیے وہ کھڑا تھا۔

''یہ بے چارے بڑے صابر لوگ ہیں۔'' لطیف نے کہا۔

''مطلب؟'' علی نے پوچھا۔

''سندھی غریب ہے لیکن صابر ہے۔ وہ اپنی غربت کا شاکی نہیں ہے۔ اپنی قسمت پر تکیہ کرکے بیٹھا ہے...'' لطیف نے جواب دیا۔

علی کی آنکھوں کی چمک تیز ہوگئی۔ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''غریب ہونا عیب ہے نہ ثواب، غربت خامی ہے نہ خوبی، یہ تو ایک کیفیت ہے جو اقتصادی عمل کی پیداوار ہوتی ہے۔ اگر یہ سندھی غریب ہے تو اس کا استحصال ہوتا رہے گا۔ اگر یہ صابر ہے تو اسے مذہبی عقیدوں اور سماجی رسموں نے خاموش کر رکھا ہے۔ وگرنہ تو کوئی بھی ہوش مند فرد ناانصافی پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ شکر کرنا تو بڑی بات ہے۔' علی نے تیز تیز انگریزی میں کہا۔ وہ جب محسوس کرتا کہ اپنے خیالات مکمل طور پر سندھی میں واضح نہیں کرسکتا تو پھر وہ انگریزی بولنے لگتا تھا۔

☆ کھمبیاں: زیر زمین اگنے والی ایک سبزی جو اروی سے مشابہت رکھتی ہے اور موسم برسات میں اُگتی ہے۔

لطیف حیران ہوکر علی کا منہ دیکھنے لگا۔ اس نے تو ایک عمومی بات کی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے کہے گئے لفظوں کا تجزیہ کیا جائے گا۔ اس نے فوراً دفاع میں کہا، ''میں نے تو صرف عام آدمی کی بات کی تھی۔''

علی کا چہرہ سرخ ہوگیا، ''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قسمت کوئی شے ہے؟'' اس نے لطیف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا لہجہ اس کے اندرونی جوش کی چغلی کھا رہا تھا۔

''کچھ نہ کچھ تو انسان کا نصیب بھی ہوگا۔''

''مذاہب خود بھی تقدیر کے متعلق بنیادی سوالات کے جوابات دینے سے قاصر ہیں۔ حالاں کہ ان کا دارومدار بھی ایک حد تک تقدیر کے یقین پر ہے۔'' علی کے لہجے میں سابقہ نرمی لوٹ آئی تھی۔ اس کی مخصوص مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔ اس نے شرارت بھرے انداز میں کہا، ''بے شک مذہب دُکھی انسانیت کے لیے افیون ہے۔'' تکالیف سے غافل کردینے والی، زخموں سے بے خبر رکھنے والی، خواہ یہ زخم ناسور میں ہی کیوں نہ تبدیل ہوجائیں۔''

اس کے شرارت بھرے لہجے میں تلخی بھی تھی جو لطیف نے اچھی طرح محسوس کرلی تھی۔ علی اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں ہونے والے جبر اور ناانصافیوں کے بابت بول رہا تھا اور لطیف سنجیدگی کے ساتھ یہ سب کچھ سنتا رہا، وہ علی کے خیالات سے متفق دکھائی دیتا تھا۔ علی کہہ رہا تھا:

''اس طرح نصیب کا تصور درد کو کم کرنے والی دوا ہے۔ اگر یہ دوا انسان کو نہ دی جائے تو وہ اپنے لٹ جانے کے خیال کی اذیت سہہ نہ سکے گا اور لٹیروں کے مقابل آن کھڑا ہوگا، ان سے ہاتھا پائی پر اتر آئے گا۔''

علی کے اندازِ گفتگو نے لطیف کو بہت متاثر کیا تھا۔ کتابوں میں درج باتیں اس کے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ اس نے تو کبھی ان باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ حالاں کہ اس کی ذاتی زندگی میں مذہب محض کسی چھید زدہ دیدہ زیب رَلّی☆ کی حیثیت رکھتا

☆ رَلّی: سندھ میں عورتیں مختلف کپڑوں کی کترنیں جوڑ کر بناتی ہیں جسے اوڑھنے، بچھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

تھا۔ عید، بقر عید کے موقع پر چارپائی پر بچھالی، بعد میں پھر لپیٹ کر صندوق میں رکھ چھوڑی۔ اسے یاد آیا کہ والدین کے انتقال پر اس کا کس طرح مذہب سے واسطہ پڑا تھا۔ مولوی، غسل، کفن، دفن، دعا، ختم اور بس! بیوی کے انتقال پر اسے دوسری بار مذہب سے سابقہ پڑا، کفن دفن کے بعد پھر مذہب اس کے لیے بیکار تھا۔ مذہب سے لاتعلقی کے باعث لطیف کے لیے علی کی باتوں سے اتفاق کرنا دشوار نہ تھا۔

علی تفصیل کے ساتھ تقدیر کے نظریے کی مدلل مخالفت کرتا رہا، وہ کہہ رہا تھا، ''ریگستانوں میں رہنے والوں کی اموات اکثر سانپوں کے ڈسنے سے ہوتی ہیں، بڑے شہروں میں لوگ ٹریفک حادثات کا شکار ہوتے ہیں، فوجی جنگوں میں مارے جاتے ہیں، وگرنہ طویل عمر پاتے ہیں۔ اگر تیراکی نہ جاننے والے کو پانی میں پھینک دیا جائے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے گا۔ اگر اس نے اپنے وزن سے زیادہ پانی ہٹا لیا تو وہ تیرنے لگے گا۔ اگر اسے صحیح طریقے سے ہاتھ پاؤں چلانا نہ آیا تو وہ ڈوب جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس پورے عمل میں کسی بیرونی قوت نے کوئی کاری گری نہیں دکھائی۔ سارا عمل قانون کے مطابق ہوا۔'' علی چپ ہوگیا، کار ایک بنگلے کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔

دروازے پر متعین گارڈز نے رائفلیں اوپر اٹھا کر سلامی دی۔ علی ان کی حرکات کو دل چسپی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے بکنگھم پیلس پر تعینات لال کُرتی والے (Red Coat) یاد آ گئے۔ لطیف نے گاڑی سائے میں کھڑی کی، دونوں نیچے اترے، بنگلے کی عمارت سے ایک وجیہہ جوان برآمد ہوا اور اپنی دونوں بانہیں پھیلائے مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ لطیف اس سے بغل گیر ہوگیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے خیر و عافیت معلوم کرنے لگے۔

سہیل مصافحہ کر کے حیرت سے علی کو دیکھنے لگا۔ لطیف نے تعارف کراتے ہوئے کہا، ''یہ علی ہے، علی! یہ سہیل ہے۔'' علی اور سہیل نے ہاتھ ملا کر علیک سلیک کی۔ سہیل نے لطیف کی طرف دیکھا، اس کی نگاہوں میں سوالیہ نشان تھا۔

''میرا کزن ہے۔'' لطیف نے برجستہ کہا۔

''سائیں کیا پڑھتے ہیں؟'' سہیل نے گردن گھماتے ہوئے پوچھا۔

''سوشل سائنسز میں بیچلرز کر رہا ہوں۔'' علی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کہاں سے؟'' سہیل کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

''کنگس کالج، کیمبرج۔''

سہیل نے گردن ہلائی جیسے اسے ساری بات سمجھ آ گئی ہو، ''آیئے سائیں!'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے اندر چلنے کی دعوت دی۔

وہ برآمدے سے ہوکر ایک بڑے کمرے میں پہنچے جہاں پرانی وضع کے دو صوفے رکھے تھے۔ اطراف میں بانس کی بنی ہوئی آرام کرسیاں رکھی تھیں۔ چھت سے لٹکتا ہوا ولایتی پنکھا۔ پنکھا دھیمی آواز کے ساتھ ہوا پہنچانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ کمرے کے کارنرز میں دو پیڈسٹل فین صوفوں کی طرف رُخ کیے کسی وفادار غلام کی طرح مستعد کھڑے تھے۔ کمرہ ٹھنڈا تھا، علی نے چھت کی طرف دیکھا جو خاصی اونچی تھی۔ سولہ فٹ تو ہوگی، اس نے سوچا۔

قہقہے کی آواز اسے خیالات سے واپس لے آئی۔

''میں نے نہیں کہا تھا کہ وہ تمھیں سیکریٹریٹ میں نہ رکھ سکیں گے۔ تین مہینوں میں تم سیکریٹریٹ سے جان چھڑا کر جا رہے ہو۔''

ایک سپاہی جگ گلاس لے آیا۔

''یو مسٹ بی ہونگ سم باڈی اَپ ڈیئر، اَدر وائز اِٹ از اِمپاسبل ٹو گیٹ آؤٹ آف دیٹ ویب۔'' سہیل نے سپاہی کی موجودگی کے باعث انگریزی میں کہا۔

''بلیو می آئی ڈڈ ناٹ ایون نیوٹل دی لاسٹ مومنٹ۔'' لطیف نے آہستگی کے ساتھ جواب دیا۔

''واٹ لاسٹ مومنٹ؟ ڈونٹ ٹیل می ڈی ٹیلو۔'' سہیل نے بے صبری سے کہا۔ سپاہی گلاسوں میں اسکوائش ڈال کر لے آیا۔

''لاسٹ ویک ڈی سی ایس آسکڈ مائی وِلنگنیس دین آئی کیم ٹو نو واٹ از ان دی آفنگ۔'' لطیف نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

سپاہی ٹرے علی کی طرف لے گیا۔ علی نے گلاس اٹھاتے ہی ایک گھونٹ لینے کے بعد مزید برف لانے کے لیے اشارہ کیا۔ بہت پیاس لگی تھی، چوکنڈی میں بھی پانی نہ ملا تھا۔ سپاہی نے برف کے دو ٹکڑے گلاس میں ڈال دیے۔ علی نے یہ گلاس پی کر مزید اسکوائش طلب کیا۔ سپاہی نے چستی کے ساتھ گلاس بھر کر علی کے سامنے رکھا اور افسران کی طرف دیکھنے لگا۔ انھوں نے اپنے اپنے گلاس سے ایک دو گھونٹ بھی بمشکل لیے تھے۔

''تم خوش قسمت ہو کہ اتنا آسان ضلع ملا ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں ٹھٹھہ بھی آسان ہے۔''

''ہاں جہاں تک جرائم کی بات ہے، باقی سیاسی ہلچل تو ہے۔''

علی نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ خاموش رہا۔ شاید کسی خیال نے اسے باز رکھا تھا۔

''آپ شاید کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔'' لطیف نے علی کے ہاتھ کی مخصوص جنبش دیکھ کر اندازہ لگایا۔ کیوں کہ علی کو جب کچھ کہنا ہوتا تو وہ اپنا بایاں ہاتھ سینے تک لاتا تھا۔ اس سوال پر سہیل بھی علی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ شاید اسے ندامت ہوئی کہ ایک مہمان کی موجودگی میں وہ اپنی گفت وشنید میں محو ہوگئے تھے۔

''آئی ایم ایکسٹریملی ساری، میں ذرا سا بے صبرا ہوں۔ اپنے میزبانی کے فرائض بھی پورے نہیں کیے، آپ مجھے معاف کردیں۔'' علی، سہیل کی پشیمانی سے پریشان ہوگیا۔ اس نے یقین دلانے کے انداز میں کہا، ''میں نے شربت سے انصاف کیا ہے اور میں آپ کی گفتگو سے بھی لطف لے رہا ہوں، آپ اپنی بات چیت جاری رکھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ میں صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ یہاں کس قسم کی سیاسی تحریک چل رہی ہے؟''

گفتگو کا رُخ موجودہ سیاسی تحریک کی طرف ہوگیا۔ انھیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

''کھانا تیار ہے۔'' سپاہی نے سہیل کے پاس آکر کہا۔

کھانے کے دوران بھی گفتگو کا زور سیاست پر ہی رہا، علی توجہ سے سنتا رہا۔

''لوکل باڈیز الیکشن کا بائیکاٹ کیا گیا۔ یہاں تک کہ تیرہ سیٹوں پر کسی امیدوار نے فارم ہی جمع نہ کرایا۔ محض سات نشستوں پر چند امیدواروں نے فارم داخل کرائے۔ اس طرح ٹاؤن کمیٹی کی باڈی نہ بن سکی۔''

علی نے کسی قسم کا تبصرہ نہ کیا۔ سہیل نے موجودہ صورتِ حال کے متعلق بتایا:

''دن میں دو تین جلوس نکلنا عام بات ہے۔''

''ان حالات میں تو آپ کی ڈیوٹی زیادہ مشکل ہوچکی ہوگی۔ لوگوں کی حکومت سے بے انتہا نفرت نے آپ کو بھی ظالموں کی صف میں لاکھڑا کیا ہوگا۔ آپ کس طرح ہجوم پر کنٹرول کرتے ہوں گے؟'' علی نے مسکراتے ہوئے سہیل سے پوچھا۔

''ہمارا دل تو یہ کہتا ہے کہ وردی اتار کر جلوس میں شامل ہوجائیں لیکن شاید اتنی ہمت نہیں ہے۔'' سہیل نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ پھر اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے بات جاری رکھی، ''بھائی ہجوم کو قابو میں رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پولیس کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ کرے۔ اسے ہجوم سے پرے رکھا جائے، وردی دیکھ کر وہ زیادہ مشتعل ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ہم جلوس سے کچھ فاصلے پر رہتے ہیں۔''

سہ پہر کے بعد علی اور لطیف ایک گائیڈ کے ساتھ مکلی کا شہرِ خموشاں دیکھنے گئے۔ سہیل ان کے ہمراہ نہ جاسکا تھا، شہر میں سیاسی کارکن گرفتاریاں دے رہے تھے۔ علی ہر قبر غور سے دیکھتا ہوا اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھتا رہا۔ علی نے دو تین مرتبہ لطیف کو کسی خاص شے کی طرف متوجہ بھی کیا۔

علی کو ذرا جلدی کرنا پڑی، اس کے باوجود جب وہ قبرستان سے لوٹے تو سورج غروب ہوچکا تھا۔ واپس بنگلے پر پہنچ کر وہ باہر رکھی بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سہیل ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ سپاہی شربتِ تھادل☆ کا جگ لے کر آیا۔ عین اسی وقت جیپ پر سہیل بھی آ پہنچا۔

''بڑے موقعے پر پہنچا ہوں، آپ کو اکیلے اکیلے تھادل پینے نہیں دوں گا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

☆ شربتِ تھادل: سندھ کا مشہور شربت جو بادام، خشخاش، سونف الائچی وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے۔

''ہم خود آپ کے منتظر تھے، بتایئے خیریت تو رہی؟ دیر کردی؟''

''بس سائیں! جلوس نے سرکاری عمارتوں پر حملہ کردیا تھا۔ آنسو گیس استعمال کرنا پڑی، بہرحال خیریت ہی رہی۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔''

''شکر ہے۔'' لطیف نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ خوش تھا کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

''چند ایسے سوالات ذہن میں ابھرے ہیں جو آپ کو شاید ناگوار گزریں، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو پوچھ لوں؟'' علی نے سہیل کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا دکھائی دیا۔

دونوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ بالکل پوچھ سکتے ہیں۔ جو باتیں آپ محسوس کرتے ہیں، بلاتکلف کہہ دیں۔ ہمارے لیے ان کا سننا ضروری ہے کیوں کہ دوسرا کوئی ہمیں ایسی باتیں نہیں بتائے گا۔'' سہیل نے سنبھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

لطیف نے جب سہیل کو رضامند پایا تو خود بھی اقرار میں گردن ہلا دی۔

''آپ محسوس کرتے ہوں گے کہ آپ کی ڈیوٹی عوام کی حفاظت کرنا اور سرکاری اور نجی املاک کو نقصان سے بچانا ہے، اور بس۔'' علی اسی لہجے میں بولتا چلا گیا، ''جب لوگ جلوس نکالتے ہیں، اپنی پسند اور منشا کا اعلان کرتے ہیں، حکومت سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں، آمر سے حکومت چھوڑنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ تقاضا کرتے ہیں کہ حکومت حقیقی نمائندوں کے حوالے کی جائے... آپ عوام کو مروت سے، چالاکی سے، تدبیر سے، منت وسماجت سے، طاقت سے، واپس گھر بھیج دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر انجام دی۔ سرکاری اور نجی املاک کی حفاظت کی، لوگوں کی جانیں ضائع ہونے سے بچالیں، قانون کی برتری قائم رکھی۔ لاقانونیت کو پھیلنے سے روک لیا۔ آپ خوش ہوتے ہیں اور اسے اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں۔ بتایئے اس بات کا کیا ہوا کہ آپ نے عوام کے جائز مطالبات کو اَن سنا کردیا، ان کی آواز کو ان کے گلے میں ہی

گھونٹ دیا۔ لوگوں کو فوجی عدالتوں تک پہنچایا۔ ان کے احکامات پر لوگوں کو کوڑے مارے، زندان میں ڈالا اور سولی چڑھایا۔ آپ نے جو جانیں افراتفری اور دنگا فساد سے بچائیں، وہ ان کا نشانہ بن گئیں۔ آپ نے قانون کا خون کیا۔ اس کا ذمے دار کون ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ سب کچھ ٹل نہیں سکتا؟ جن لوگوں کو اندھی بہری عدالتوں نے سزائے موت سنائی، جنھیں فوج نے گولیاں ماریں۔ کہا وہ سب کچھ محض اتفاقیہ تھا؟''

''نہیں سائیں! یہ اموات منصوبہ بندی کے تحت واقع ہوئی ہیں۔ جانب دار انگلیاں ٹرائیگر دباتی ہیں، کھولتا ہوا سیسہ نکلتا ہے اور کوہِ نور کا ہیرا چھلنی چھلنی ہوکر ڈھہ جاتا ہے۔ بندوق کا فولاد ٹھنڈا نہیں ہے اور نہ ہی غیر جانب دار ہے، یہ فولاد زندہ ہے۔ اس میں غاصب کی اقتدارانہ ہوس کا خیال مسلسل بجلی دوڑاتا رہتا ہے اور وہ ہاتھ جو بندوق تھامے ہیں، نشانہ لیتے ہیں، ٹرائیگر دباتے ہیں، وہ بھی مجرم ہیں۔ انھیں اس جرم سے بری نہیں کیا جاسکتا۔

''آپ بھی ظلم کی اس دیوار کو سلامت رکھنے کے ذمے دار ہیں۔ اس طرح عوامی تحریک کو ختم کرنے اور کچلنے کے محرک ہیں۔ آمر کی آمریت کو مستحکم کرنے کے معاون ہیں۔ آمریت کے ہاتھوں ہونے والی ناانصافیوں میں مددگار بن کر غریب کی غربت اور تذلیل کے محرک ہیں۔ ذہنی اور سیاسی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، ظلم اور جبر کے سلسلے میں شرکت دار بن کر انسانیت کے قافلے کو روک...''

سہیل اور لطیف کے ہونٹوں کی مسکراہٹ رفتہ رفتہ معدوم ہوتی چلی گئی اور وہ انتہائی سنجیدہ ہوگئے۔ انھوں نے علی کی مخالفت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید پہلی مرتبہ کسی نے انھیں موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ حیرت اور صدمے کے باعث دونوں چپ تھے۔ وہ ابھی تک جواب میں کچھ کہنے کا سوچ نہیں سکے تھے۔

''...لیکن آپ عام حالات میں اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں موجود استحصال خود بخود ختم ہوجائے گا اور آپ پُرسکون زندگی گزاریں گے؟ جب تک ناانصافی کے خلاف عمل شروع نہ کیا جائے، یہ ہرگز ختم نہ ہوگی۔ جب تک ہم مسلط نظام کی مخالفت نہیں کرتے، خواہ ہم کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، حتیٰ کہ خود

ہمیں کیوں نہ پستے رہیں۔ درحقیقت استحصال کا ساتھ دیتے ہیں۔''

سہیل نے اقرار میں گردن ہلائی، وہ اس بات سے متفق معلوم ہوتا تھا۔ مگر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ علی خاموش ہوگیا، وہ منتظر تھا کہ سہیل اپنی رائے کا اظہار کرے۔

''میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ تحریک تو حکومت کے خلاف ہے۔ اس میں استحصالی طبقے یا نظام کے خلاف بظاہر تو کوئی بات نظر نہیں آتی، یہ تو جمہوریت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔'' سہیل نے کہا۔

''بے شک یہ صرف جمہوریت کا تقاضا کرتے ہیں لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سوشلسٹ انقلاب کوئی جداگانہ عمل ہے؟ یا یہ کہ جمہوریت کے لیے جدوجہد لوگوں کو اس سے پرے کردے گی۔ اس طرح منزل نگاہوں سے اوجھل ہوجائے گی۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ایسا انقلاب ایک مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں ہی ممکن ہو پاتا ہے۔ طبقاتی نظام کے خاتمے کے لیے جمہوریت کا قیام ضروری ہے۔ جب تک محنت کش طبقہ مکمل، مسلسل انقلابی جدوجہد نہیں کرتا، تب تک یہ ممکن نہیں ہے۔'' علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''علی ہمیں نوکری سے نکلوا کر دم لے گا!'' سہیل نے لطیف کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ کسا۔ تینوں بیک وقت قہقہے لگا کر ہنس پڑتے ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد ان کے ہمراہ سہیل بھی مکلی کا شہرِ خموشاں دیکھنے گیا۔ وہ بھی مدھر چاندنی میں مکلی کا قبرستان دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا۔

چاندنی میں پتھروں کی تعمیرات عجب نظارہ دے رہی تھیں۔ مقابر اپنی گولائیوں پر چاند کی ٹھنڈی روشنی سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ پتھروں میں ابھرے نقوش ان کی سختی کا تصور ختم کر رہے تھے۔ ماحول میں دل کش نرماہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے من کے تاروں پر سہانا راگ چھیڑ دیا ہو۔ قبرستان کی لافانی اداسی نے دلوں میں سوز پیدا کردیا تھا۔ ہر ذہن اس اداسی کو اپنی زندگی کی غیر حقیقی روش کی طرف اشارہ سمجھ رہا تھا۔ بے مقصد زندگانی روزمرہ مصروفیات سے یوں الگ ہوکر کھڑی تھی جیسے کوئی پنچھی اپنی ڈار سے بچھڑ کر پریشان کھڑا ہو۔ من کے مندر میں خوشی کی گھنٹیوں کے بجائے کسی کوئل

کی دلدوز کوک تھی جو اس کے درد کا اظہار کر رہی تھی۔ تینوں خاموشی کے ساتھ قبرستان کی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ کسی نے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ شاید اپنے اپنے سوزِ دل کو ظاہر کرنے سے گھبراتے ہوں۔ وجود کی سرکشی نے ان کی زندگیوں کے کھوکھلے پن کے اعتراف سے باز رکھا تھا۔ علی ان دونوں سے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کا دماغ خیالات کی گردان میں تھا۔ وہ چلتے چلتے رُک جاتا اور پھر خراماں خراماں ان اجنبی پگڈنڈیوں پر چل دیتا۔ وہ رات کے ایک بجے کے قریب لوٹے تھے۔

وہ رات کو ایک بجے کے قریب لوٹے تو اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو رہے۔ صبح ناشتے کے بعد سہیل سے الوداع ہو کر حیدرآباد روانہ ہو گئے۔ راستے میں دو تین مقامات پر قبریں دیکھیں۔ علی نے ان خوب صورت قبروں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا، ''کندہ کاری کا یہ فن بھی باثروت لوگوں نے اپنا رتبہ، عزت اور وقار بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ یوں ہنرمندوں کی سرپرستی تو ہوئی مگر کاری گر کو فن کار بننے کے لیے جو آزادی درکار ہوتی ہے، وہ روایت پسند امیر، نواب، جاگیردار اور سردار کی تقلید اور باہمی چپقلش کی عادات کے باعث میسر نہ ہو سکی۔ غریب ہنرمند جو ہنر کے ذریعے اپنے وجود کا اظہار کرنا چاہتا تھا، ہمیشہ سرمائے کا محتاج رہا۔ کیا آپ کو ان ڈیزائنوں میں فن کار کی گھٹی چیخ سنائی نہیں دیتی؟ پتھروں کی یہ بڑی بڑی چٹانیں بہت مہنگی پڑتی تھیں، جنگ شاہی اور سورن سے پتھر منگوانے پر کافی اخراجات آتے تھے۔''

لطیف پوری توجہ سے علی کی باتیں سنتا رہا۔ وہ کبھی کبھی کوئی سوال کر لیتا۔

''روایت پسندی کے باعث بعد کے دور کی قبروں سے نقوش گری کا فن دھندلاتا چلا گیا اور یہ ہنر تقلید کی وجہ سے وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو کر رہ گیا۔''

لطیف جو علی کے تجزیے کی صلاحیت کا معترف تھا، اس نے گردن ہلا کر علی کے خیالات سے اتفاق کیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ شاید ذہن میں علی کی باتیں دُہرا رہا ہو، ''لیکن میں آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں کروں گا کہ یہ حسین و جمیل قبریں دکھاوے اور مقابلے کی خاطر بنائی گئی تھیں اور یہ ان میں مدفون لوگوں کے حسنِ ذوق کا پتا نہیں

دیتیں۔'' لطیف نے اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا۔

علی کے چہرے پر دل کش مسکراہٹ لوٹ آئی۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ میری بات سے متفق نہ ہوں گے۔ یقیناً اصل بات یہ ہے کہ زیادہ تر قبریں ان لوگوں کی ہیں جو قبائلی جھگڑوں میں مارے گئے۔ اس علاقے کے اس دور میں قبائلی غرور ہر شے پر حاوی نظر آتا تھا۔ اگر آپ جنگ نامے (Epic Poetry) پڑھیں تو وہ ہمیں اس زمانے کی جذباتی کیفیات سمجھنے میں انتہائی معاونت کریں گے۔ ہر خاندان اور قبیلے نے اپنے مردوں اور جوانوں کی قبروں کو مروّجہ فیشن کے مطابق زیادہ دیدہ زیب بنوانے پر ترجیح دی، مثلاً پتھر پر اشعار نمایاں ہوں۔ حسین چارن، جمن چارن، جلال کھٹی اور تم فقیر وغیرہ کے ابیات میری بات کی تصدیق کریں گے — حتیٰ کہ چند قبروں پر تو کل تخمینہ بھی درج ہے۔'' اس نے شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ لطیف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جملہ پورا کیا۔

''کیا مطلب؟'' لطیف حیرت کے مارے چیخا۔

''ان میں سے چند قبروں پر یہ بھی درج ہے کہ ان کی تعمیر پر کتنی رقم خرچ ہوئی۔'' علی نے جواب دیا۔ حیدرآباد کی قابلِ ذکر جگہیں انھوں نے صبح ہی دیکھ لیں۔ بعد میں وہ سندھیالاجی☆ گئے۔ سندھیالاجی کو علی نے دل چسپی کے ساتھ دیکھا تھا۔ خاص طور پر میوزیم جہاں سندھی معاشرت کے کئی نمونے موجود تھے۔ لائبریری سے کچھ مواد فوٹو اسٹیٹ کرایا۔ مجموعی طور پر علی نے سندھیالاجی کو بہت پسند کیا۔

''اس کے پھیلنے پھولنے کے لیے جس مضبوط بنیاد کی ضرورت ہے، وہ پڑ چکی ہے۔ باقی کام کو آگے بڑھانا ہے۔ اس کے لیے مسلسل لگن کی ضرورت ہے۔'' علی نے سندھیالاجی کی بابت اپنا خیال ظاہر کیا۔

لطیف نے علی کی گہری نظر کے اعتراف میں دو تین مرتبہ گردن ہلائی۔

☆ سندھیالاجی: جامعہ سندھ کی چار دیواری میں واقع ایک شعبہ جس میں سندھی تہذیب و ثقافت کے تاریخی نوادر محفوظ ہیں۔

اڑھائی بجے کے قریب جب وہ لطیف آباد میں الطاف کے گھر پہنچے تو وہ ان کے انتظار میں پریشان بیٹھا تھا۔ سہیل نے اسے اپنی آمد کی اطلاع کر رکھی تھی۔ الطاف، لطیف کا بچپن کا دوست، ٹیلی فون کے محکمے میں انجینئر تھا۔ اس نے مہمانوں کا نہایت تپاک سے استقبال کیا۔ وہ لطیف پر خفا بھی ہوا کہ وہ لوگ سیدھے اس کے ہاں کیوں نہیں آئے، وہ صبح سے منتظر تھا۔

''رہا تفریح کا سوال تو ہم اکٹھے ساری جگہیں دیکھ لیتے۔ مجھ سے نالائق کو بھی کچھ معلومات حاصل ہوجاتیں۔'' الطاف نے غصے میں شکایت کی۔

''بھائی ہم آپ کو آفس ٹائم میں تنگ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے تو سہیل سے کہہ دیا تھا کہ وہ آپ کو یہ بات بتا دے۔ باقی آپ جو بھی جرمانہ کرنا چاہیں، ہم حاضر ہیں۔'' لطیف نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔ علی دل چسپی سے دونوں دوستوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ تھی۔

دوپہر کا کھانا پُرتکلف تھا۔

''مارکیٹ میں بھی کوئی شے چھوڑی ہے یا سب کچھ لے آئے ہیں؟'' لطیف نے ہنستے ہوئے میز کی طرف اشارہ کیا۔

''چھوڑیں سائیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے— آپ قسمت سے تو آئے ہیں۔'' الطاف نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ کھانے کے دوران گفتگو کا موضوع موجودہ سیاسی تحریک ہی رہی۔

''ہمارے ساتھی تحریک میں حصہ نہیں لے رہے بلکہ بعض اوقات تو وہ تحریک پر تنقید کرتے ہیں۔'' الطاف نے دکھ کے ساتھ کہا۔ اس پر علی نے حیرت کے ساتھ لطیف کی طرف دیکھا، اسے الطاف کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ لطیف سے اس کی تشریح چاہ رہا تھا۔

''سائیں! معذرت خواہ ہوں، ہم اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد تحریک سے لاتعلق ہے۔'' الطاف نے علی کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا، ''اس کی وجہ یہ ہے کہ مارشل لا والوں نے سیٹلرز کو ہمیشہ مقامی لوگوں پر فوقیت دی ہے اور وہ سیٹلرز سے مخبری بھی کراتے

رہے ہیں۔'' الطاف سنجیدہ تھا۔

''کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ یہ تحریک بنیادی طور پر دیہاتوں میں زور و شور سے چلی ہے، ظاہر کہ سیٹلرز وہاں کم تعداد میں ہیں؟'' علی نے استفسار کیا۔

''بہرحال میں تو یہی کہوں گا کہ ہم نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا ہے، اس کا سبب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔'' الطاف نے علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

شام کو انھوں نے کوٹری بیراج پر دریا کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ٹھنڈی ہوا نشہ طاری کر رہی تھی۔ علی کو پلّہ مچھلی بڑی لذیذ لگی۔

''افسوس کہ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے، وگرنہ جی بھر کر پلّہ مچھلی کھائی جاتی۔'' علی نے دھیمے لہجے میں کہا، تاہم لہجے کی اداسی چھپ نہ سکی۔

صبح ناشتے کے بعد انھوں نے الطاف سے اجازت لی۔

حیدرآباد سے روانہ ہوتے ہوئے انھیں اندازہ ہوگیا کہ ہڑتال کی نوعیت کیا ہے۔ شہر میں تو اِکا دُکا گاڑیاں چل رہی تھیں لیکن ہائی وے پر بالکل سکوت طاری تھا۔ البتہ روڈ کے اطراف میں ہوٹلوں پر گاڑیاں کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔

''ٹریفک کم ہونے کی وجہ سے ہم نواب شاہ جلد پہنچ جائیں گے۔'' لطیف نے اپنے منتشر خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

علی نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ کے اشارے سے سامنے سے آنے والی فوجی جیپ کی طرف متوجہ کیا جس میں سوار ایک فوجی ہاتھ سے انھیں رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ جیپ کی رفتار انتہائی کم تھی، وہ سڑک کے درمیان کھڑی ہوگئی۔ اشارہ کرنے والے نے دائیں ہاتھ کے جارحانہ انداز میں رکنے کو کہا۔ شاید کار کی رفتار کم ہوتی دیکھ کر انھیں اپنی اہمیت اور طاقت کی خوش فہمی ہوگئی تھی۔ وہ جیپ سے اتر کر کھڑے تھے۔ علی یونی فارم دیکھ کر فوجی رینک کا اندازہ کر رہا تھا۔

''جونیئر کمیشنڈ آفیسر ہے۔'' لطیف نے گاڑی روکتے ہوئے علی کو بتایا۔ علی نے گردن کو خفیف سی جنبش دی۔

''کون ہو، کہاں جا رہے ہو؟'' فوجی لطیف کے نزدیک آ کر رعب دار آواز میں بولا۔

''سرکاری ملازم ہوں، نواب شاہ جا رہا ہوں۔'' لطیف نے اطمینان سے جواب دیا۔

فوجی اس کا اطمینان دیکھ کر پریشان ہوگیا، لیکن آواز کو بھاری بناتے ہوئے کہنے لگا، ''کیا آپ کو علم نہیں کہ ہڑتال ہے؟ آپ کدھر کو چل نکلے ہیں؟''

''کیا ہڑتال سرکاری ہے اور آپ کو ٹریفک روکنے کے احکامات ہیں؟'' لطیف نے جواب دینے کے بجائے اسی اعتماد کے ساتھ الٹا سوال کر ڈالا۔

فوجی بوکھلا گیا، اس کی رعب قائم رکھنے کی کوشش میں اس کی پریشانی نے عجب مزاحیہ صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ علی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

''میرا مطلب ہے کہ سر... راستے میں مظاہرین پتھراؤ کر رہے ہیں، گاڑیاں روک رہے ہیں۔ کہیں آپ کو نقصان نہ پہنچائیں۔''

''شکریہ، ہم اپنا بندوبست کرلیں گے۔'' لطیف نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اپنا ہاتھ باہر نکال کر لہرایا۔ فوجی کی پریشانی بڑھ گئی، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے عجلت میں سلوٹ کر دیا۔

''مجھے اس کا رویہ سمجھ میں نہیں آیا۔'' علی نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کا لہجہ کسی گہری سوچ کی چغلی کھا رہا تھا۔

''ایک لطیفہ مشہور ہے کہ فوج میں کامیابی کے چار سنہری اصول ہیں۔ سینئر کی تابع داری، جونیئر پر رعب، چلتی شے کو سلیوٹ اور ساکت چیز کو رنگ روغن کرنا۔'' لطیف نے کہا۔ دونوں ہنسنے لگے۔

''حقیقت یہ ہے کہ یہاں ان کا رویہ ٹھیک نہیں ہے، یہ مقامی لوگوں پر اعتماد نہیں کرتے۔ حکومت مخالف جماعتوں کو ملک دشمن قرار دیتے ہیں۔ سیٹلرز کو فوقیت دیتے ہیں...'' لطیف نے مارشل لا کے مجموعی رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

ابھی انھیں سفر کرتے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ پولیس کی نیلی پک اپ سامنے سڑک کے کنارے کھڑی دکھائی دی۔ چند سپاہی بھی کھڑے تھے۔ ایک سپاہی نے

گاڑی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ وہ ٹریفک سپاہی تھا۔ اس کے انداز میں روایتی چستی نہ تھی۔

''ٹریفک بند ہے۔ گاڑی سائیڈ میں کر کے کھڑی کر دیں۔ تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''اپنے انچارج کو بلاؤ؟'' لطیف نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر کہا۔

''سائیں آپ کا تعارف؟'' اس نے ادب سے پوچھا۔

''میں مجسٹریٹ ہوں، لطیف علوی!'' لطیف نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ سپاہی جلدی جلدی آگے بڑھ گیا۔

علی نے کھڑی گاڑیوں کی قطار اور لوگوں کے ہجوم کا جائزہ لیا۔ لوگوں کے انداز سے بے نیازی واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ انھیں تاخیر ہونے پر کوئی طیش تھا، نہ ہی وہ وقت ضائع ہونے پر فکرمند تھے۔ وہ ان حالات کے عادی معلوم ہوتے تھے۔

تھانے دار سپاہی کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔ اس نے کسی جذبے کے بغیر سلیوٹ کیا اور منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''بھئی کیا بات ہے؟'' لطیف نے معتبرانہ انداز میں ٹریفک روکنے کی وجہ دریافت کی۔

''سائیں آگے جلوس ہے۔ سیاسی کارکن گرفتاریاں دے رہے ہیں۔'' تھانے دار نے سبب بتایا۔

''روڈ بلاک تو نہیں ہے؟'' لطیف نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں سائیں روڈ بلاک نہیں ہے، لیکن ڈی ایس پی صاحب نے حفظِ ماتقدم کے طور پر صرف تھوڑی دیر کے لیے ٹریفک رکوالی ہے۔ تھانے دار نے خود کو بری الذمہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میں چلتا ہوں، مجھے ذرا جلدی ہے، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں احتیاط کروں گا۔'' لطیف نے گویا فیصلہ صادر کیا۔ تھانے دار محض ''جیسے مرضی سائیں'' ہی کہہ سکا تھا۔ لطیف نے گاڑی آگے بڑھائی تو تھانے دار نے سلیوٹ کیا۔ اس بار سلیوٹ

میں قدرے جوش تھا۔

گاڑی شہر آ پہنچی۔ آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ لطیف نے گاڑی برابر والی گلی میں لے جا کر کھڑی کردی۔ دونوں گاڑی سے اتر کر اجتماع کی طرف چل دیے۔ علی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ صرف آنکھوں میں تجسس تھا۔ ہالہ شہر میں جلسہ ختم ہونے کی کارروائی میں کافی وقت لگ گیا۔ نعرہ نما تقریریں اور پتلے نذرِ آتش کرنے کے بعد سیاسی کارکنوں نے گرفتاریاں پیش کیں۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہونے کے باوجود لوگوں نے احسن طریقے سے سخت فوجی قانون کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ سب کچھ کیا تھا۔ جن کارکنوں نے گرفتاریاں پیش کرنا تھیں، انھوں نے ہی نعرے بازی کی اور پتلوں کو آگ لگائی۔ اس طرح پولیس نے ان کو قانون شکنی کے الزام میں گرفتار کرلیا اور اجتماع کے دیگر شرکا نے نعروں کا جواب دے کر اور تالیاں بجا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

علی نے لوگوں کے اس احتجاجی مظاہرے کو دل چسپی کے ساتھ دیکھا۔ ہجوم منتشر ہوا تو وہ بھی روانہ ہوگئے۔ راستے میں انھیں پولیس کی اِکا دُکا گاڑیاں ملیں۔ لطیف کے تعارف کرانے پر انھیں بلاتردّد آگے جانے کی اجازت دے دی جاتی۔ ایک جگہ فوج کی گاڑی نے انھیں روکا اور تلاشی دینے کے لیے کہا گیا۔ لطیف کے تعارف کرانے کے باوجود فوجیوں نے تلاشی لی تھی۔ لطیف کو فوجیوں کے رویے پر سخت طیش آیا اور اس نے اپنے غصے کا اظہار بھی کیا لیکن نتیجہ صفر رہا۔

''آپ کا انچارج کون ہے؟'' لطیف نے پوچھا۔

''میجر صاحب، کیوں؟'' جواب ملا۔

''میں ان سے تمھاری شکایت کروں گا، وہ کہاں ہیں؟'' لطیف نے ترش لہجے میں پوچھا۔

''میجر صاحب گشت پر ہیں۔'' روکھا سا جواب ملا۔

لطیف نے گاڑی گیئر میں ڈال دی۔ علی کی موجودگی کی وجہ سے اسے فوجیوں پر زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے پر سامنے سے ایک فوجی جیپ نمودار ہوئی۔ اس

میں سے ایک سوار نے اشارہ کر کے لطیف کی گاڑی کو روکنا چاہا۔ لطیف نے سڑک کے عین بیچ گاڑی روک دی۔ وہ اس وقت سخت اشتعال میں تھا۔

''اب کیا ہے؟'' اس نے کھڑکی سے گردن نکال کر سخت لہجے میں پوچھا۔

جیپ سے ایک تنومند میجر برآمد ہوا۔ پچھلے دروازے سے ایک حوالدار بھی اچھل کر نیچے اتر آیا۔

''آپ نیچے اتر کر اپنی تلاشی دیں۔'' میجر نے روکھے پن کے ساتھ کہا۔

''ابھی تو وہاں تلاشی لی گئی ہے۔'' لطیف نے ہاتھ کے اشارے سے پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''بار بار کاہے کی تلاشی؟''

حوالدار نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا اور لطیف کا بازو پکڑتے ہوئے کہا، ''نیچے اترو۔''

لطیف اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے گاڑی سے باہر نکل آیا اور میجر کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا، ''میں لطیف علوی ہوں، ڈپٹی کمشنر۔''

میجر کے تاثر میں کوئی فرق نہ آیا۔

''سر ہماری ڈیوٹی ہے کہ ہم آنے جانے والی گاڑیوں کی تلاشی لیں تاکہ مہلک ہتھیار ملک دشمنوں کے پاس نہ پہنچ سکیں۔ آپ خود ذمے دار آفیسر ہیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔'' میجر نے جواب دیا۔

لطیف نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا، ''جتنا چاہیں اسلحہ برآمد کریں۔ ایسا ڈھیٹ پن تو کہیں نہیں دیکھا۔ اگر ہمارے ساتھ یہ رویہ ہے تو عام شہریوں کے ساتھ آپ جانے کیا کرتے ہوں گے۔''

حوالدار نے جھک کر سیٹوں کے نیچے تلاشی لی، اس کے بعد وہ گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف گیا، ''سر ڈگی کھولیں۔'' اس نے لطیف سے کہا۔

علی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے ڈک اوپر کو اٹھا دیا۔ گاڑی کا انجن دیکھ کر حوالدار کے چہرے پر الجھن نظر آنے لگی۔ اس نے میجر کی جانب دیکھا۔

''بیوقوف! اس کی ڈگی آگے ہوتی ہے!'' میجر نے خفا ہوکر حوالدار کو ڈانٹا۔

ان کا سفر پھر شروع ہوگیا۔ گوٹھوں اور چھوٹے شہروں میں ہر جگہ انھیں ہڑتال دکھائی دی۔ سکرنڈ شہر میں مظاہرین کا بڑا جلوس تھا۔ نواب شاہ کی جانب جانے والی سڑک بلاک تھی۔ انھوں نے گاڑی سڑک سے ہٹ کر ایک محفوظ جگہ پر کھڑی کردی۔ پتا یہ چلا کہ صبح کو جلوس پر فائرنگ سے چند افراد ہلاک اور کئی زخمی ہوگئے تھے۔ فوج لاشوں اور زخمیوں کو نواب شاہ اسپتال لے گئی تھی۔ نواب شاہ کو جانے والا راستہ بند کردیا گیا تھا کہ مبادا لوگ جمع ہوکر کوئی ہنگامہ برپا نہ کریں۔ یہ مجمع قریبی گوٹھوں کے دیہاتیوں کا تھا جو فائرنگ کی آواز سن کر اکٹھے ہوگئے تھے۔ وہ فوج کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔

نہر سے ذرا پہلے چیک پوسٹ پر گاڑی کی تلاشی لی گئی۔ لطیف نے اب کوئی اعتراض نہ کیا۔

''ہم اس کیمرے کا رول نکالیں گے۔'' صوبے دار میجر نے علی کے کیمرے پر اعتراض کیا۔

''رول سے آپ کو کیا سروکار، اس میں ہماری آرکیالوجی کی تصاویر ہیں۔'' لطیف نے بلاتوقف کہا۔

''ہمیں کیا معلوم اس میں مظاہروں یا فائرنگ کی تصویریں نہیں ہیں؟'' صوبے دار میجر نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے اعتراض جاری رکھا۔

''لیکن ہم اپنی قیمتی تصاویر یوں ضائع نہیں کریں گے۔'' لطیف نے بھی دوٹوک جواب دیا۔

''آپ اپنا ایڈریس دے جائیں اگر تصویریں قابلِ اعتراض نہ ہوئیں تو رول آپ کو بھجوا دیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر صوبے دار میجر نے کیمرہ کھولنے کی ناکام کوشش شروع کی۔

علی نے اس کے ہاتھ سے کیمرہ واپس لینے کے بعد رول نکال کر اس کے حوالے کیا۔ اس کے لبوں پر مخصوص مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس نے فوجیوں کی کارروائی پر طیش نہ دکھایا۔ صوبے دار میجر نے رول قبضے میں لینے کے بعد چیک پوسٹ کا بیریئر اوپر

اٹھانے کا اشارہ کیا۔ لطیف نے گاڑی آگے بڑھائی اور ان کا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔

نہر پر انھیں زندگی کا تعطل صاف طور پر دکھائی دیا۔ وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرے۔ ان کا میزبان ہوٹل کا مالک تھا۔ اس نے بڑے پُرجوش انداز میں سیاسی حالات بیان کیے۔ اس نے بتایا کہ ہر روز مظاہرے ہوتے تھے۔ مظاہرین اور پولیس کے درمیان دو تین جھڑپیں بھی ہوئی تھیں۔ متعدد افراد مارے جاچکے تھے۔ اس کے باوجود لوگوں کا احتجاج تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''سائیں! کئی پولیس والے بھی مارے جاچکے ہیں۔'' وہ بتا رہا تھا، ''اس دن لڑکیوں کے جلوس کے موقع پر پولیس نے پھاٹک بند کردیا۔ وہاں فائرنگ ہوئی، پولیس کی گاڑی جلا دی گئی، آٹھ افراد موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ سائیں ڈی ایس پی اور اے سی کے ساتھ تو بہت بری ہوئی، گھروں میں چھپنے پر مجبور ہوگئے۔ عورتوں نے قرآنِ پاک کے واسطے دے کر ان کی جان بچائی۔''

''کب کی بات ہے؟''

''سائیں ہفتہ بھر ہوا ہوگا۔ اس سے پہلے کئی گاڑیاں جلائی گئیں۔ روڈ تو اب تک بند ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا، اس کی آنکھوں میں اشتیاق بھری چمک پیدا ہوئی۔

''سائیں! آپ حیدرآباد، کراچی کے حالات بتائیں۔ یہاں تو کوئی خبر نہیں پہنچتی۔'' اس نے لطیف سے کہا۔

جب وہ نہر سے روانہ ہوئے تو شام ہوچکی تھی۔ دادو شہر پہنچ کر سرکٹ ہاؤس کا رُخ کیا۔ وہاں فوجیوں کا قبضہ تھا۔ کافی دیر سر کھپانے کے بعد ایک کمرہ خالی کرکے انھیں دیا گیا۔ انھوں نے غسل کیا اور لباس تبدیل کرکے لان میں آ بیٹھے۔ علی نے ہاؤس کیپر سے دادو شہر کی خبریں پوچھنا شروع کر دیں۔ ہاؤس کیپر نے کسی تکلف کے بغیر سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتایا۔ جنرل کے دورے کی باتیں نہایت تلخ لہجے میں دیہی مزاح کے ساتھ سنائیں۔

''سائیں! انھیں اور تو کوئی ملا نہیں، ہمیں لے جاکر بٹھا دیا، تقریر سننے کے

لیے۔ مجھے شیروانی پہنائی گئی۔ کہاں شیرو (شیر محمد) کہاں شیروانی ہا... ہا... ہا۔'' وہ ایک طویل قہقہہ لگا کر ہنسا، ''سائیں! جان داؤ پر لگی تھی۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ایس پی صاحب کا جس نے کرنل سے الجھ کر معاملے پر قابو پایا وگرنہ کھڑاک سنتے۔'' وہ بیٹھا عام لہجے میں بولے جا رہا تھا۔ علی کو اس کی باتیں صحیح طور پر سمجھنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ البتہ وہ لہجہ سمجھ کر نتیجہ اخذ کر رہا تھا، ''سائیں بے چارے کے طوطے اُڑ گئے، کہنے لگا، یہاں ہیلی کاپٹر نہیں اتر سکتا۔'' جیسا تیسا کر کے عباسی نکال کر لے گیا۔ نصیب اچھے ہیں۔''

''کوئی خاص واقعہ؟'' علی نے اسے مزید کریدا۔

''سائیں! آپ خود جانتے ہیں کہ جیل توڑ کر قیدیوں کو فرار کرایا گیا۔ فائرنگ سے تین افراد موقع پر ہلاک ہوگئے۔ بس سائیں روزانہ جلوس نکلتے ہیں، کل بینک جلا دیا گیا، اسلحے کی دکان توڑ کر تین سو بندوقیں لوٹ لی گئیں... سائیں اب لوگ لڑیں گے، بہت برداشت کر چکے۔'' وہ بھرا بیٹھا تھا۔

رات کو علی اور لطیف دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ دن بھر جو کچھ دیکھا، سنا، وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اب تک وہ اس ہڑتال کو سیاسی تحریک سمجھ رہے تھے لیکن اب ان کے ذہنوں میں دیگر خیالات جنم لے رہے تھے۔

''ان حالات میں ہم کیسے یہ تسلیم کرلیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ باقاعدہ سیاسی پروگرام کے تحت ہو رہا ہے؟'' علی کہہ رہا تھا، ''ہزاروں ایسے سیاسی کارکن جو کوئی منصوبہ بندی کرنے کے قابل ہیں، وہ بہت پہلے پابندِ سلاسل کر دیے گئے ہیں، پھر بھی یہ کیونکر ممکن ہوا؟''

لطیف چپ چاپ علی کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے کوئی جواب دینے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

''میں یہ سمجھ پایا ہوں کہ عوام مظالم اور زیادتیوں سے تنگ آ چکے ہیں۔ پولیس کی لوٹ مار اور فوج کے مظالم سے لوگ عاجز آ گئے ہیں، یہ بغاوت ہے۔ کسی سیاسی لائحۂ عمل کے بغیر۔ عوامی سیلاب کے سامنے زمیں دار بھی بے بس ہیں، مجبوراً انھیں بھی باہر نکلنا پڑا ہے۔ اب بظاہر تو وہ عوام کے ساتھ چل رہے ہیں، لیکن ان کی چال میں لکنت ہے۔ وہ

سمت بدلنے کی کوشش میں ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ لوگ زیادہ آگے نہ بڑھیں۔ یہ عافیت پسند بغاوت کو ناکام بنا دیں گے۔ افسوس کہ اس تحریک کو تربیت یافتہ کارکن اور پُرخلوص راہ نما میسر نہیں آئے— نہیں نہیں...!'' علی جوش میں تھا، اس کی نگاہیں کسی جذبے کی چغلی کھا رہی تھیں، جسے لطیف نے پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اک انجانے خوف نے اسے جکڑ لیا تھا۔

اگلی صبح انھوں نے پیدل شہر کا چکر لگایا۔ اس لیے انھیں دادو شہر سے روانہ ہونے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ فوج اور عوام کے مابین پائی جانے والی کشیدگی واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ فوج شہر میں یوں گشت کرتی پھر رہی تھی جیسے دشمن کے علاقے پر قبضہ کرلیا ہو۔ فوجی کیمپ شہر سے باہر تھا اور لوگوں کی نقل و حرکت پر سخت نگرانی تھی۔ کسی کو بھی کیمپ کے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی۔ حکومت کے نمائندہ ادارے کسی پر بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انٹیلی جنس والے ہر کسی کے متعلق رپورٹیں بھجوا رہے تھے۔

شہر سے باہر نکلتے وقت چیک پوسٹ پر گاڑی کی تلاشی لی گئی۔

لطیف محتاط ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ہر وقت کسی ناخوش گوار واقعے کا اندیشہ موجود تھا۔ اسے ان حالات میں سفر کرنے کے تصور سے ہی نفرت تھی، جن میں کسی شہری کی عزت اور جان محفوظ نہ ہو۔ فوج عوام کو انسان سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ان کا رویہ لوگوں کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے کو کافی تھا۔ لطیف بہت دل برداشتہ ہوا تھا، اس کی تشویش بڑھ چکی تھی۔ اس نے علی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ دو چار دن لاڑکانہ میں ٹھہرنے کے بعد آگے جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ علی نے اس پروگرام پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ محض مسکرا کر رہ گیا۔

راستے میں گشت کرنے والی گاڑیوں نے انھیں روکا، رسمی پوچھ گچھ اور تلاشی کے بعد سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔

سامنے کوئی شہر دکھائی دیا، قریباً چھ سو گز کے فاصلے پر ایک ٹرک شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے افراد بھی نظر آرہے تھے۔ فاصلے کی وجہ سے نعروں کی آوازیں تو سنائی دے رہی تھیں مگر کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ٹرک سوار کیا نعرے لگا رہے تھے۔

ٹرک رکا تو لطیف نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کی۔ اچانک فضا میں فائرنگ کی آواز گونجی۔ لطیف کے پاؤں نے بریک پر دباؤ بڑھا دیا۔ گاڑی رگڑ کی آواز کے ساتھ رُک گئی۔ سامنے سڑک پر کھڑے فوجی زمین پر لیٹ گئے۔ لوگوں کی چیخیں بلند ہوئیں۔ چند فوجی سڑک کے اطراف میں کھدے مورچوں میں جا گھسے۔ لوگ ٹرک سے اتر کر چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ ٹرک جھٹکے کے ساتھ چلا اور تیز رفتاری کے ساتھ نگاہوں سے غائب ہوگیا۔

لطیف اور علی کی آنکھوں میں تجسس اور چہرے پر بے چینی صاف طور پر ابھر آئی تھی۔ نصف گھنٹے تک وہ گاڑی میں بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ تاہم فضا پر سکوت طاری رہا۔

لطیف نے علی کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔ علی نے گردن ہلا کر ''ہاں'' میں جواب دیا۔

لطیف نے گاڑی اسٹارٹ کی، گاڑی آہستہ آہستہ شہر کی طرف بڑھنے لگی۔ شہر سے باہر چیک پوسٹ قائم کی گئی تھی جس سے تیس گز پہلے ہی انھیں گاڑی روکنا پڑی۔ سڑک کے کنارے کچی اینٹوں سے بنے مورچے میں بیٹھے حوالدار نے ہاتھ کے اشارے سے روکنے کا اشارہ دیا تھا۔ لطیف نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

سامنے شہر کی سمت سے نعرے لگاتا ہوا جلوس چلا آ رہا تھا۔

''شاید شہری فائرنگ کی آواز سن کر اُدھر کا رخ کر رہے ہیں۔ وہ جاننا چاہ رہے ہوں گے کہ آخر ہو کیا رہا ہے۔'' علی نے اندازہ لگایا۔

جلوس کا رخ چیک پوسٹ کی طرف تھا جہاں اب کوئی بھی فوجی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''یہ لوگ اپنے گرفتار ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کسی معصوم بچے کا بھی ذکر ہو رہا ہے۔'' لطیف نے نعرے بازی سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔

علی چیک پوسٹ کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی نگاہوں میں شدید بے چینی کی لہر تھی۔ اس لہر کی طغیانی بڑھتی چلی گئی۔ اس نے فوجیوں کو زرد رنگ کی بلڈنگ کے اوپر

خاموشی کے ساتھ مشین گن فٹ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ فوجیوں نے آنے والے جلوس کو نشانے پر لیا اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔

علی نے اپنے وجود کو اس لہر کے بہاؤ میں بہتا ہوا محسوس کیا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ وہ جلوس کے شرکا پر فائرنگ کا پختہ ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔ اس ظلم و زیادتی کے خیال نے علی کو بے چین کر ڈالا۔ وہ اچھل کر کار سے باہر نکلا اور جلوس کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کے ذہن میں معصوم اور بے گناہ انسانوں کی لاشیں گھومنے لگیں، '...اُنھیں اس طرح نہیں مرنا چاہیے...' ذہن چیخا۔ علی دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا، ''واپس لوٹ جاؤ! فوجی تم پر گولیاں برسائیں گے۔ واپس مڑ جاؤ، وہ گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ لوٹ جاؤ!'' وہ چلاتا ہوا دوڑتا رہا اور جلوس کے قریب تر پہنچ گیا۔ اس کے دماغ میں یہی جنون سوار تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے، ان معصوم لوگوں کو بربریت کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔ اسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں تھیں۔ اسے یقین تھا کہ جلوس کے لوٹ جانے پر فوجی لازماً اس پر خفا ہوں گے۔ وہ چلاتا رہا، ''پلٹ جاؤ— جلدی کرو— واپس—'' مگر اب اس کی آواز میں بے بسی اور کرب نمایاں تھے۔ کسی بھی لمحے سانحہ رونما ہوسکتا تھا۔ کوئی خطرناک حادثہ— کسی خوف ناک سازش پر عمل درآمد ہوا چاہتا تھا۔

جلوس اپنی ثابت قدمی کے ساتھ اس حد تک قریب پہنچ چکا تھا کہ کسی بھی لمحے اس پر فائرنگ ہوسکتی تھی۔ علی کی چیخ پکار نے ایک لمحے کے لیے جلوس کے شرکا کو چونکا دیا، وہ ٹھٹکے ضرور مگر جلوس آگے بڑھتا رہا۔

فضا مسلسل فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

موت کا گیت شروع ہوگیا۔

شکار ہونے والوں کی آہ و بکا، زخمیوں کی چیخ پکار اور زندگی کی شکست کی آوازیں اس گیت کا حصہ بن گئیں۔

کچھ دیر قبل جو ایک لہر کی مانند چل رہے تھے جن میں زندگی کی امنگ تھی جو آزادی کے پروانے تھے، جو اپنے حقوق طلب کر رہے تھے۔ وہ توانا اور ناتواں، جوان اور

بچے اب لاشے بن کر ٹوٹی شاخوں کی طرح ڈھیر ہو رہے تھے۔ مشین گن کی کھلی فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایک لکیر تھی، موت کی لکیر، چکر کاٹنے کے بعد مشین گن کی گولیاں اسی دائرے میں آجاتیں۔ زمیں بوس ہوتے ہوئے جوان جسموں پر گولیوں کی لکیر کھنچتی چلی جا رہی تھی۔

ایک نوجوان جس کی ٹانگ سے لہو بہہ رہا تھا، وہ اس لکیر کی زد میں آنے کو تھا۔ موت اسے ہڑپ کرنے کو منہ کھولے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک اور زندگی کا دِیا بجھنے کو تھا۔

علی نے دوڑ کر اس نوجوان کا بازو کھینچ کر اسے مشین گن کی زد سے موت کی لکیر کے حصار میں آنے سے بچایا۔

مشین گن نے اسی سمت پلٹنے کی بجائے اپنا زاویہ بدلا۔

خاموشی کا ایک چھوٹا سا لمحہ—

''تڑ...تڑتڑ..ڑ...ڑ...'' کی آواز گونجی۔

علی کے پیٹ پر ران سے لہو کی دھار بلند ہوکر گری، اس کا بایاں ہاتھ بلند ہوا لیکن حلق سے کوئی آواز نہ نکلی اور وہ ایک ادھیڑ عمر کی لاش پر جا گرا۔

جلوس کے شرکا کو یہ گمان تک نہ تھا کہ بلاوجہ وارننگ دیے بغیر، گھات میں بیٹھے فوجی نہتے افراد پر فائر کھول دیں گے۔

لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اکثر کو یہ سوچنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔

لوگ بھاگنے لگے— اِدھر اُدھر— ہر طرف خود کو بچانے کے لیے— موت کے خونخوار پنجوں سے خود کو بچانے کے لیے...

''تڑ...تڑ...ڑ ڑ ڑ ڑ...'' اب دوسری جانب سے بھی فائرنگ کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ جلوس پر عقب سے بھی فائرنگ شروع کردی گئی تھی۔ پیٹرولنگ سے لوٹنے والے فوجیوں کی فائرنگ نے بھاگنے اور چھپنے کی راہیں مسدود کر ڈالی تھیں۔ انسانی جسموں کے ڈھیر لگ گئے۔ گرم انسانی لہو کے فوارے پھوٹ نکلے تھے، گویا کوئی چشمہ بہہ نکلا ہو۔ لہو کی سرخی نے دھرتی کو رنگین کردیا تھا۔ تڑپتے جسموں سے خوں بہتا رہا۔ لاشوں کی تعداد بڑھتی

رہی۔ زندگی شکست سے دوچار ہوئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

مر جانے والوں کی کھلی آنکھوں میں بے یقینی کے ساتھ یہ سوال واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

لطیف جس کی آنکھوں کے سامنے یہ سانحہ ہو گزرا تھا، وہ صدمے سے مرجھا گیا تھا۔ وہ کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ گاڑی سے اترا لیکن اس کی ٹانگوں میں چلنے کی سکت نہ تھی۔ اس نے تیز قدم اٹھانے چاہے مگر ٹانگوں نے ساتھ نہ دیا اور سڑک پر گر گیا۔ وہ علی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کے خالی ذہن میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ بمشکل دو چار قدم ہی چلا تھا کہ چکرا کر پھر گر گیا۔ اس کی ٹانگیں ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ یوں لگا جیسے جان جسم سے نکل کر آنکھوں اور دماغ میں اٹک گئی ہو۔ وہ گرتا پڑتا، آہستہ آہستہ گھسٹتا ہوا علی کے قریب پہنچا۔ اطراف کے ماحول سے قطع نظر اس کے ذہن میں ایک ہی دھن سوار تھی۔

فائرنگ ختم ہو چکی تھی، فوجی اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے تھے لیکن اسے خبر نہ تھی۔

علی نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ لطیف ایک خوف سے لرز گیا اور بے اختیار علی کی نبض دیکھنے لگا۔

'علی زندہ ہے...!' اس کے ذہن نے گواہی دی۔

''اسے بچایا جا سکتا ہے...''

وہ جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور ہانپتا کانپتا گاڑی کی طرف چل دیا۔ گاڑی علی کے قریب لا کر روک لی۔ نیچے اتر کر علی کو اٹھانے کی کوشش کی، ایک فوجی اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ لطیف نے اسے ہاتھ کے اشارے سے مدد کرنے کے لیے کہا۔

''تم کون ہو؟ یہ ہمارا کام ہے؟ تم یہاں سے ہٹ جاؤ!'' فوجی نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں لطیف علوی، ڈپٹی کمشنر ہوں، یہ میرا بھائی ہے، اسے فوراً اسپتال پہنچانا

ضروری ہے، جلدی کریں۔'' فوجی کے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے لطیف نے اعتماد سے جواب دیا۔

فوجی یہ اعتماد دیکھ کر اپنے ذہن میں فیصلہ کر چکا تھا لیکن اسے آرڈر نہ تھا۔ اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا، ''سر آپ ہمارے افسر سے بات کریں۔''

''بیوقوف! یہ موقع وقت ضائع کرنے کا نہیں ہے۔'' لطیف نے غصے سے ڈانٹا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے کچھ بڑبڑایا اور علی کو کار کی پچھلی سیٹ پر لٹانے میں لطیف کی مدد کی۔

لطیف نے اسپتال کا پوچھا، فوجی نے ہاتھ کے اشارے سے اسپتال کا بتا دیا۔ لطیف پوری طرح اپنے حواس میں تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ علی کی زندگی بچانے کے لیے فوری طبّی امداد کی ضرورت ہے۔ اسپتال پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ ڈسپنسری ہے، ایک ڈسپنسر انتہائی مصروف دکھائی دے رہا تھا۔ لوگوں کا اژدہام تھا، جگہ جگہ زخمی پڑے ہوئے تھے، ان کے ورثا کپڑوں سے ہوا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ آہ و بکا سے مختصر سی عمارت گونج رہی تھی۔ کسی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کسی موہوم امید کی آس میں جمع ہونے والے یہ لوگ صورتِ حال کی نزاکت سے پوری طرح باخبر دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ظلم و تشدد نے جیسے ان کے ذہنوں کو مفلوج کر ڈالا تھا۔

لطیف کے دماغ میں بس ایک ہی بات تھی، دنیا میں سب سے عزیز ہستی کی جان خطرے میں تھی، اس کی زندگی بچانا ہی واحد خواہش تھی۔ لطیف ڈسپنسر کی مصروفیت کو نظرانداز کرتے ہوئے، اسے بازو سے تھام کر باہر کھینچ لایا۔ لطیف نے اس کے کان میں ہولے سے کوئی بات کی تھی۔

ڈسپنسر علی کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا، ''اسے بڑے اسپتال لے جائیں کسی ایمبولینس کا بندوبست کریں۔''

''ایمبولینس کہاں سے مل سکے گی؟'' لطیف نے فوراً پوچھا۔

''سائیں دادو شہر سے۔'' جواب ملا۔

''فون کہاں ہے؟''

''سائیں سامنے ایکسچینج ہے۔'' ایک نوجوان نے ہاتھ کے اشارے سے لطیف کو بتایا۔ وہ ڈسپنسر کے پہلو میں کھڑا تھا جو پٹیوں سے علی کا خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں فون کر کے آتا ہوں۔'' لطیف نے علی کی طرف دیکھ کر ان دونوں کی طرف دیکھا، گویا ان سے سفارش کر رہا ہو۔

''سائیں آپ جلدی جائیں، میں بھائی کا خیال رکھتا ہوں۔'' نوجوان نے اسے تسلی دی۔

لطیف نے ایکسچینج کی طرف دوڑ لگائی، جوں ہی وہ عمارت کے نزدیک پہنچا برآمدے میں موجود فوجی نے للکار کر اسے ہاتھ اوپر کرنے کا آرڈر دیا۔

''میں آپ کے انچارج سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' لطیف ہانپتے ہوئے بولا۔

''تم ہو کون؟''

''انسان!'' لطیف نے شدید غصے اور نفرت سے جواب دیا۔ نتیجہ سوچتے ہوئے تیزی سے کہا، ''مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے، ایک زخمی کی حالت نازک ہے، اس کے لیے ایمبولینس منگوانی ہے۔'' اب اس کے لہجے میں التجا کی جھلک مخفی نہ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے سر! کسی کو بھی خبر نہ ہوگی، تمام ثبوت مٹا دیے جائیں گے— آل رائٹ سر!'' اندر کمرے میں کوئی فون پر بات کر رہا تھا جس کی آواز باہر سنائی دے رہی تھی۔

دروازہ کھلنے پر ایک لیفٹیننٹ باہر نکلا، وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے سخت لہجے میں فوجی سے پوچھا۔

''مجھے ایک اشد ضروری کال کرنی ہے، زخمی کی حالت تشویش ناک ہے۔'' لطیف نے اس سے کہا۔

''لائن کٹی ہوئی ہے۔ زخمیوں کو ہمارا ٹرک اسپتال پہنچا دے گا۔ یہ آپ کا دردِ سر نہیں ہے— جائیں۔'' لیفٹیننٹ نے قریب کھڑی جیپ کی طرف رخ کیا۔ لطیف نے اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا اور لہجے میں رعب پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''میں لطیف علوی— ڈپٹی کمشنر ہوں۔ میرا بھائی شدید زخمی ہے، دادو شہر سے ایمبولینس منگوانے کے لیے فون کرنا ہے۔ مجھے آپ کا یہ غیر ذمے دارانہ رویہ سخت ناپسند ہے۔''

لیفٹیننٹ کی پریشانی بڑھ گئی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جان کیسے چھڑائے۔ اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد خود کو سنبھالتے ہوئے کہا، ''ہم زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ انھیں اسپتال پہنچانا ہماری ذمے داری ہے، آپ کا بھائی فوجی کیمپ پر حملے کرنے والوں کا ساتھی ہے، وہ قانون کا مجرم ہے۔ ایسے سارے مجرم ہماری تحویل میں رہیں گے۔ ان پر فوجی عدالتوں میں کیس چلائے جائیں گے۔ مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔'' لیفٹیننٹ کے لہجے میں پوشیدہ نفرت کی بو فضا میں پھیل گئی۔

لطیف غصے سے کپکپانے لگا۔

''اس قدر زیادتی، قتلِ عام کر کے باتیں کس طرح کی کر رہے ہیں؟'' اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''اس وقت میں اس بات کا فیصلہ کرنے نہیں آیا، یہ فیصلہ وقت کرے گا، تاہم ایک زندگی بچانے کے لیے فون کرنا نہایت ضروری ہے۔''

''فون استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، یہ کمانڈنگ آفیسر کا حکم ہے۔ سر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکتا۔'' لیفٹیننٹ نے لاتعلقی سے فیصلہ صادر کیا۔

وہ جا کر جیپ میں بیٹھ گیا اور جیپ روانہ ہو گئی۔

لطیف نے نفرت کے عالم میں نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے مٹھیاں بھینچیں اور طیش میں زمین پر پاؤں مارا، وقت کی نزاکت کے احساس نے اس کے اشتعال پر تشویش کو غالب کر دیا اور وہ لرزنے لگا۔

ڈسپنسر مرہم پٹی کر کے جا چکا تھا، نوجوان لڑکے نے علی کو گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا تھا۔

''لائن کاٹ دی گئی ہے، فون نہیں ہو سکا۔'' لطیف نے ہانپتے ہوئے بتایا۔

''سائیں اسی گاڑی پر چلنا چاہیے، وقت کم ہے۔ دادو شہر کو جانے والی سڑک بند

کردی گئی ہے۔ ہمیں لاڑکانہ جانا چاہیے۔ وہاں بڑا اسپتال ہے۔'' نوجوان نے مشورہ دیا۔

قریباً بیس سال عمر، طویل قامت، چھوٹی داڑھی، متناسب جسامت، لطیف نے نوجوان کا جائزہ لیا۔

''میں بیٹھ کر بھائی کو سنبھالتا ہوں۔'' نوجوان یہ کہتے ہوئے پچھلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔

ایکسلیٹر پر لطیف کے پیر کا دباؤ بڑھتا گیا۔ وہ مزید ایک لمحہ ضائع کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کار کی رفتار تیز تھی۔ اس کے ذہن میں طوفان برپا تھا۔ وہ بار بار گردن موڑ کر علی کو دیکھتا بھی جاتا تھا— آگے روڈ بلاک تھا۔ اچانک بریک لگی، گاڑی نے جھٹکا کھایا۔

''آہ— آ!'' کی آواز لطیف کے کانوں نے سنی، اذیت کی بے شمار ٹیسیں اس کے پورے بدن میں سرایت کر گئیں۔

فوجی گاڑی سے باہر آنے کا اشارہ کر رہا تھا، ''ایک شدید زخمی کو اسپتال پہنچانا ہے۔ انسانی زندگی کا سوال ہے،'' لطیف نے چیخ کر کہا، فوجی نے دوبارہ سختی سے گاڑی سے باہر نکل آنے کو کہا۔ اس نے رائفل کا رخ گاڑی کی طرف ہی رکھا تھا۔

لطیف بے چینی کے شدید احساس تلے ڈانٹنے کی خاطر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے فوجی سے کہنے لگا، ''میں سرکاری ملازم ہوں، ایک غیرملکی فائرنگ کی زد میں آکر شدید زخمی ہوگیا ہے۔ اس کی جان بچانے کے لیے اس کا فوری طور پر لاڑکانہ پہنچنا ضروری ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا!'' فوجی کی آنکھوں میں کش مکش دکھائی دی، ''ہمیں آرڈر نہیں ہے۔''

''آپ کا کمانڈر کہاں ہے، میں اس سے بات کروں گا!'' لطیف نے اس بحث کو فضول سمجھتے ہوئے جان چھڑائی۔

''میجر صاحب راؤنڈ پر ہیں۔'' فوجی نے لاپروائی کے ساتھ جواب دیا۔

''بیوقوف ایک غیرملکی مہمان کی زندگی کا سوال ہے۔ ہماری حکومت کو جواب دینا پڑے گا۔ میں تم سے بحث کر کے وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا، میں جا رہا ہوں۔'' لطیف کو

فوجی کے رویے پر غصہ آ گیا۔ غصے کے عالم میں دوڑتے ہوئے اس نے کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر گیئر لگا دیا۔ فوجی فوراً گاڑی کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا اور اسے رائفل کے نشانے پر رکھتے ہوئے گاڑی سے نیچے اترنے کو کہنے لگا۔

لطیف غصے اور بے بسی سے نڈھال ہوگیا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا، باہر نکلتے ہوئے اپنا لہجہ تبدیل کیا، ''میں ڈپٹی کمشنر ہوں، زخمی مقامی نہیں ہے جسے یوں تڑپا تڑپا کر مارا جائے۔ مجھے تم نے روک رکھا ہے، اگر کچھ ہوگیا تو ذمے داری تم پر ہوگی۔ لطیف نے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔

فوجی شش و پنج میں پڑ گیا۔

''اپنا نام اور نمبر لکھواؤ تا کہ کل تم سے جواب طلبی کی جا سکے۔'' لطیف نے آخری حربہ استعمال کیا۔

فوجی نے ''مگر... لیکن...'' بڑبڑاتے ہوئے روڈ سے رکاوٹ ہٹانے کا اشارہ کیا اور لطیف ایک لمحے کو بھی نہ رکا۔

اسپیڈو میٹر کی سوئی پینسٹھ اور ستر کے درمیان لرز رہی تھی۔ لطیف کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسپیڈو میٹر اس کے دل کی دھڑکن بتا رہا ہو، ذہن میں کئی خیالات آ رہے تھے لیکن اس نے کسی بھی خیال کو ذہن میں ٹھہرنے نہ دیا۔ وہ تمام اندیشوں کو جھٹک کر امید سے جڑا رہنا چاہتا تھا۔ اس پر صرف ایک ہی خیال حاوی تھا— جس طرح بھی ممکن ہو، اسپتال پہنچا جائے۔ اس کی ساری امیدوں کا محور اسپتال تھا۔ وہ علی کی جان بچانے کی خاطر ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھا۔ شاید اپنی زندگی داؤ پر لگانا بھی اس کے لیے دشوار نہ تھا۔

ذہن میں خیالات کا انتشار جاری رہا۔

لطیف نے مڑ کر پیچھے دیکھا، علی ہنوز بے ہوش تھا۔ اس کے جسم سے رِسنے والے لہو نے نوجوان کے کپڑے سرخ کرنا شروع کر دیے تھے جو علی کو احتیاط سے تھامے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر لاچارگی پھیلی ہوئی تھی۔

ضائع ہوجانے والے قیمتی لمحوں کا تصور، گزرتے وقت کا احساس، علی کے زخموں سے رِستا خون، فوجیوں کا رویہ، راستے کی رکاوٹیں— سب باتوں نے مل کر معاملے کو گمبھیر بنا ڈالا تھا۔ اس قدر شدید حادثے کے دکھ نے اس کے دماغ کو قریباً ماؤف کر ڈالا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت معطل ہوگئی تھی۔

علی کی زندگی خطرے میں تھی اور یہ زندگی بچائی جاسکتی تھی۔ اس امید نے لطیف کو حوصلہ ہارنے سے روک رکھا تھا۔ وگرنہ تو اس کی آنکھوں نے اس قدر مظالم ہوتے دیکھے تھے کہ دو چار روز تک وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک زندگی— کسی عزیز ہستی کی زندگی بچانے کی جدوجہد نے دیگر احساسات کو غالب نہیں ہونے دیا تھا۔

گاڑی پر سکوت طاری تھا، لطیف نے کسی اندیشے سے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ علی کے کراہنے کی آواز کچھ دیر پہلے بند ہوچکی تھی۔ پیچھے بیٹھے نوجوان نے علی کے جھولتے ہوئے بازو کو احتیاط سے بغل میں لیتے ہوئے لطیف کی آنکھوں میں موجود خوف کو محسوس کرلیا اور اپنی گردن کو جھکا کر آنکھیں بند کرکے علی کے اب تک بے ہوش رہنے کی تصدیق کی۔ لطیف چوکنا ہوکر بیٹھ گیا۔

سامنے روڈ پر کسی کی موجودگی نے اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی... اس نے بغور دیکھا۔ فوجی روڈ کے کنارے کھڑا تھا۔ بانس کے بیریئر سے روڈ بند کر رکھا تھا۔ لطیف کی میلی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ اس نے نفرت سے سڑک پر تھوکا ڈالا۔ دانت بھینچ کر ایکسلریٹر پر پیر کا زور بڑھا دیا۔ وہ مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ علی کی حالت خراب تھی، اس کی زندگی شدید خطرے سے دوچار تھی اور یہ احساس لطیف کو پگل کردینے کو کافی تھا۔

''گولیاں برسانے کے بعد زندگی کا راستہ بھی روکتے ہو...'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

سامنے کھڑے فوجی کو جب اندازہ ہوا کہ آنے والی گاڑی کی رفتار میں کوئی کمی نہیں ہو رہی ہے تو اس کے چہرے پر فکرمندی اور خوف کی لہر ابھر آئی۔ اس نے پھرتی کے ساتھ رائفل کندھے سے اتار کر گاڑی کی طرف سیدھی کرلی۔

لطیف نے دانت پیستے ہوئے پاؤں ایکسلریٹر سے اٹھا کر بریک پر رکھ دیا۔ فضا میں چرر...ر...ر... کی آواز نے لطیف کے دل کے درد کی صدا کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ گونج پیدا کی۔ گاڑی گھسٹتی ہوئی بیریئر کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔

''ہمارے ساتھ ایک زخمی ہے جسے اسپتال پہنچانا ضروری ہے۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'' لطیف نے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے بتایا۔

''ہمیں کسی بھی گاڑی کو چھوڑنے کی اجازت نہیں۔'' فوجی نے دوٹوک جواب دیا۔ اس کے لہجے سے لاپروائی ظاہر ہو رہی تھی۔

''لیکن آپ کو کسی انسان کی زندگی لینے کا بھی آرڈر نہیں ہے۔'' لطیف نے ترش لہجے میں کہا۔ اسے غصہ آنے لگا تھا۔

''زندگی وندگی کا ہمیں نہیں پتا، آپ باہر آ کر تلاشی بھی دیں۔'' فوجی اسی لہجے میں بولا۔

''ہاں تم موت کے سوداگر ہو، تمھیں انسانی زندگی کی اہمیت سے کیا سروکار!'' لطیف نے تلخ لہجے میں کہا۔ دفعتاً اس کے ذہن نے خبردار کیا اور اس نے اپنا لہجہ بدلا، ''میں لطیف علوی ہوں ڈپٹی کمشنر... اس وقت میں رک نہیں سکتا۔ ایک غیرملکی کی زندگی خطرے میں ہے۔ اسے طبی امداد پہنچانا ضروری ہے۔'' لطیف نے اپنی شناخت کراتے ہوئے موقع کی نزاکت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

''سر! آپ یہ بات میجر صاحب کو بتائیے گا۔ ہمیں کسی بھی گاڑی کو چھوڑنے کا آرڈر نہیں ہے۔'' فوجی نے اپنی تربیت کے مطابق سمجھ کا مظاہرہ کیا۔

شدید غصے کے عالم میں لطیف کپکپاتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اس کے چہرے پر رونما ہونے والی تبدیلی دیکھ کر فوجی دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ لطیف کے چہرے کی نسیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور کندھے نیچے کو ڈھلک گئے۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر فوجی سے کہا، ''میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ ہمیں لیٹ نہ کرو... انسانی جان کا سوال...'' بے بسی کے شدید احساس نے اسے چور چور کر ڈالا تھا۔ اس کی

آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوگئے۔ وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف کرتا ہوا بولا، ''میں تمھارے پاؤں پڑتا ہوں— ہمارا وقت...'' سسکی نے اس کا جملہ پورا نہ ہونے دیا۔ شاید اس کی آنکھوں سے بہتے پانی نے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ۔ بجھانے کی کوشش کی تھی۔

''...ڈز...ڈز...'' کی تیز آواز لطیف کو اس کے جنون سے واپس لے آئی۔

فوجی کے سینے میں دو سرخ سوراخ ہوگئے تھے، وہ کمر کے بل سڑک پر جاگرا۔

لطیف نے گاڑی کی طرف دیکھا، نوجوان کے ہاتھ میں پستول تھا جو اس نے اپنا بازو سیدھا کرکے کھڑکی سے باہر نکال رکھا تھا۔

لطیف نے دوڑ کر بانس کو اوپر کیا اور آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی کے پہیے تیز آواز کے ساتھ گردش کرنے لگے۔ لطیف کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ وہ ہونٹ بھینچے سامنے دیکھتا رہا۔

گاڑی کی رفتار بڑھتی رہی۔

غروب ہوتے سورج کا سفر تیز تر ہوتا گیا۔ دن اپنے اختتام کو جا پہنچا تھا۔ گرمی ختم ہوچکی تھی۔ لاڑکانہ اب محض چند میل دُور رہ گیا تھا۔ لطیف نے گردن موڑ کر علی کی طرف دیکھا، اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ اسے ہچکی آئی۔

نوجوان نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی روکنے کو کہا۔

لطیف کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ اس نے شدید خوف محسوس کرتے ہوئے گاڑی کو روکا۔ اب تک وہ کسی آس پر چل رہا تھا۔ کسی سائے کے تعاقب میں دوڑ رہا تھا، لیکن اب تو وہ سایہ بھی اس سے جدا ہو رہا تھا۔ وہ امید کے سہارے ہر قسم کی جدوجہد کرنے کو تیار تھا۔

لیکن آس ٹوٹ جانے کے بعد...اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔

نیچے اتر کر کانپتے ہاتھوں سے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر علی کے قریب ہوتے ہوئے لطیف نے اس کی آواز سننے کی کوشش کی۔ علی کا بایاں ہاتھ اوپر اٹھا۔ اس نے انگریزی میں کہا، ''میری...دھرتی...''

''سائیں، بھائی کو نیچے اتاریں...'' نوجوان نے لطیف کو بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

فضا میں دکھ کی سوگواری پھیلی ہوئی تھی۔

لطیف، علی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ وہاں کوئی ایسی نشانی تلاش کر رہا تھا جو آنے والے لمحوں کے متعلق کچھ بتا سکے۔ مگر وہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ لہو ضائع ہو جانے کی وجہ سے علی کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ علی نے آنکھیں کھولیں، لطیف کو اپنی جانب دیکھتا پا کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود کر آئی۔ لیکن مسکرانے سے اس کی نقاہت کے باوجود وہ علی کی دل جوئی کی خاطر بھی مسکرا نہ سکا۔ اَن جانے اندیشے اب واضح ہونے لگے تھے۔

علی نے ہولے ہولے بولنا شروع کیا، ''بھیا... خدا حافظ... اپنی...'' اس کی آواز مزید مدھم پڑنے لگی۔ لطیف کی دھڑکن کمزور پڑنے لگی۔ بے بسی کے مارے اس کا ذہن باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔

اس کی آنکھوں نے کیا کیا نہ دیکھا تھا...

اس نے قیامت جھیلی تھی۔ قتلِ عام— بربریت اور سنگ دلی کا ایسا مظاہرہ دیکھا تھا جس کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔ بے گناہوں کے تڑپتے گھائل وجود، زخموں سے بہتا ہوا تازہ خون، بے سدھ لاشیں، اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتی رہیں۔ اس کا وجود امید اور مایوسی کے درمیان بھٹک رہا تھا۔

امید اور مایوسی کا سنگم۔

یہ ایک ایسا دوراہا ہے جہاں پہنچ کر انسان عجب سوچ رکھتے ہوئے ناممکن تمناؤں پر بھی اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔ وہاں ممکن یا ناممکن میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ بس اگر کچھ ہوتا ہے تو خواہشوں کی شدت اور طلب کی انتہا—

وہ علی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں یلغار کرنے والے وسوسوں نے جست لگائی، اس نے چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر رو دے...

اس کا ساتھی، دوسرے ملک سے آنے والا مہمان— دھرتی کا فرزند— جب اپنی سرزمین پر آیا تو اسے اپنے لہو کا خراج دینا پڑا— لیکن پھر اَن دیکھی امید کی کرنیں

ڈوبتے دل کو روشن کرنے لگیں۔ لطیف اس روشنی کو وہم سمجھنے کے بجائے حقیقت قرار دینے کو تیار تھا۔

نوجوان نے اپنا ہاتھ لطیف کے کندھے پر رکھ کر متوجہ کیا۔ اس نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ نوجوان کی آنکھوں میں امید کے سائے نے خاموش سوال کے ساتھ آمیزش ہوکر عجیب بے بسی کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ نوجوان نے بہت ضبط کرکے اپنے اشک روکے اور اشارے سے علی کو سہارا دینے کے لیے کہا۔ دونوں نے مل کر احتیاط کے ساتھ علی کو گاڑی سے نیچے اتار کر زمین پر سیدھا لٹا دیا۔ علی کی ہچکی جاری تھی۔

اس قدر حرکت دینے کے باوجود علی کے چہرے پر تکلیف کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ لطیف، علی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کبھی کبھی امید کے دیے کی چمک ابھر آتی جو فوراً ماند پڑ جاتی۔

آنے والی اندھیری رات کے ہولناک تصور نے لطیف کے وجود کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس کی کل کائنات تاریک ہوا چاہتی تھی۔

نوجوان پٹیاں درست کر رہا تھا۔

علی نے آنکھیں کھولیں۔ لطیف کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس بار یہ مسکراہٹ بھرپور تھی، لطیف کا سارا وجود اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔ وہ علی کی اس مسکراہٹ کے سہارے اپنی ڈوبتی تمناؤں کو تیرانا چاہتا تھا۔

علی کا بایاں ہاتھ اوپر کو اٹھا— اس کے لب ہلے لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔ اس نے گردن کو خم دے کر غریب ہوتے سورج کی آخری سنہری کرنوں کو دیکھا۔

لطیف کے ہاتھ میں علی کی نبض مچل کر ساکت ہوگئی— اس کا ہاتھ بے جان ہوکر نیچے ڈھلک گیا۔

لطیف نے اپنے سینے میں کسی شے کو زبردست دھماکے سے ٹوٹتا ہوا محسوس کیا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

مرسی کلنگ

کمشنر صاحب کے فکرمند چہرے پر نظر پڑی تو میں اطمینان کرنے کی خاطر کھانے کا انتظام دیکھنے چلا گیا۔

دعوت کا اہتمام ایک بڑے پنڈال میں کیا گیا تھا۔ بٹلر اپنے بیروں کی فوج کے ساتھ تیار تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک دکھائی دے رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد کھانا شروع کرنے کا کہہ کر میں سرکٹ ہاؤس کی بلڈنگ میں واپس چلا آیا۔ جہاں چیف منسٹر صاحب مختلف وفود سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔

میں نے صنعت کاروں کے وفد کو تیار رہنے کا اشارہ کیا۔ اب ملاقات کے لیے ان کی باری تھی۔ کافی لوگ جمع ہو گئے تھے جو انفرادی طور پر ملاقات کے خواہش مند تھے۔ جن میں ضرورت مند، سرکاری جماعت کے کارکن، نوکریوں کے متلاشی بے روزگار نوجوان، افسر شاہی کے ستائے ہوئے درخواست گزار... غرض یہ کہ قسم قسم کے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔

ایسے لوگوں کی ملاقات کے متعلق واضح ہدایات نہیں ملی تھیں۔ وقت بھی محدود تھا اور کمشنر صاحب کے خیال میں ایسے لوگوں کو ملوانا مناسب بھی نہیں تھا۔ ان کے ملنے سے کئی مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ ایسے لوگوں کو بے اعتنائی کے ساتھ ٹال دیا تھا۔ چند ایک نے

اصرار بھی کیا مگر میں نے توجہ دیے بغیر انکار کردیا۔ مجھے یقین تھا کہ ایسے روکھے جواب سے یہی سمجھا جائے گا کہ واقعی ملاقات ممکن نہیں ہے اور اب کوئی بھی شخص اپنی درخواست نہیں لائے گا۔ ''سائیں مجھے ملوا دو۔'' کسی نے ملاقات کی خواہش کی۔

مجھ پر بیزاری نے حملہ کیا۔ بیزاری اور چڑ کا آپس میں بڑا قریبی رشتہ ہے۔ جی چاہا کہ سائل کو جھڑک دوں۔ کمشنر صاحب نے ایسی ملاقاتیں کرانے سے منع کیا تھا۔ میں نے یہاں سے اٹھ کر چلے جانا مناسب سمجھا۔ تاکہ جھنجھلاہٹ میں کوئی سخت جملہ نہ کہہ جاؤں۔ یہ بھی تسلی کرنی تھی کہ ڈرائیوروں اور باڈی گارڈز نے کھانا کھالیا ہے۔ کیوں کہ چیف منسٹر صاحب نے کھانے کے فوراً بعد روانہ ہو جانا تھا۔ راستے میں انھیں ایک جلسے سے خطاب کرنا تھا۔

''مجھے ملوا دو سائیں!''

کسی نے پھر اصرار کیا مگر مجھے تاؤ نہیں آیا۔

حیرت ہوئی کہ شدید جھنجھلاہٹ میں بھی غصہ کیوں نہیں آیا۔ سائل کی آواز میں بے بسی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

اندازاً چالیس سال عمر، جاذبِ نظر چہرہ، چہرے کی ہر سلوٹ میں دکھ کا احساس پنہاں اپنی عمر سے کہیں بڑا دکھائی دیتا تھا۔ کسی صدمے کا مارا ہوا تھا۔

''سائیں مجھے ایک منٹ کے لیے ملنے دو— بس ایک منٹ۔''

مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے گھبراہٹ میں کہا۔

شاید وہ ابھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس کی۔ سینے میں دکھ کی ایک ان دیکھی لہر پیدا ہوئی اور سمندر کی لہر کی طرح جلد ہی ختم ہوگئی۔

بابا کس کس کو ملواؤں— تمھیں اندر جانے دیا تو باقی لوگ ہنگامہ کر ڈالیں گے— میں نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

اس کی میلی آنکھوں میں شفاف موتی اگ آئے اور اس کے چہرے پر پڑی گرد

میں بدل کر ختم ہوگئے۔ جانے کیوں میں نے اپنا دل ڈوبتا محسوس کیا۔ اس قدر بے مروّت تو میں کبھی بھی نہ تھا۔ اس خیال نے مجھے سنبھال لیا۔

''بتاؤ کیا ضروری کام ہے؟'' میں نے رعب سے پوچھا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات مجھے تھما دیے۔

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے نام درخواست تھی۔ عنوان تھا، ''رحم کی اپیل'' اس کے ساتھ سزائے موت کے آرڈر کی کاپی تھی۔ انسانی زندگی کا سوال تھا۔ جس سے دیگر کئی زندگیاں وابستہ تھیں۔

دکھ بجلی کی طرح میرے وجود میں سرایت کر گیا، مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ جلدی سے لمبا سانس لیا۔

''یہ بات ہے! آؤ میرے ساتھ۔''

میلی آنکھوں میں امید کی روشنی جگمگائی، اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ میرے ساتھ چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ امید اور آس نے اس کے قدم بھاری کر دیے تھے، وہ خود کو گھسیٹ رہا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر درخواست گزار کو چیف منسٹر کے روبرو کرتے ہوئے عرض کیا۔

''سائیں! بڑی اذیت میں ہے، پلیز اس کی مدد کریں، اپنا بندہ ہے، نہایت مسکین ہے...''

درخواست چیف منسٹر کے ہاتھ میں تھما کر گردن جھکاتے ہوئے میں نے دھیمی آواز میں کہا، ''سفارش ضرور کیجیے گا... نا انصافی ہوئی ہے...'' میری آواز بھر آئی۔ مزید کچھ نہ کہا گیا، چپ کر کے کمرے سے باہر آ گیا۔

عدالتی فیصلے کے الفاظ ذہن میں گونجنے لگے Hang him by neck, till he is dead ہینگ ہم... ڈیڈ... ڈیڈ...''

اس شخص کی غم زدہ صورت آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ دل میں دکھ اور درد

کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ بدن سے سانس نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اٹھارہ سالہ نوجوان کو سیاست کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

موت کی سزا انسانیت کی پیشانی پر بدنما داغ ہے۔ انسانی معاشرے کی ناکامی کا ثبوت ہے۔ دل سے چیخ ابھری، ''ہینگ ہم... ہینگ ہم...'' ذہن میں ہتھوڑے برستے رہے۔ کئی ممالک میں سزائے موت پر پابندی ہے۔ حال ہی میں فرانس میں بھی سزائے موت کو ختم کردیا گیا ہے۔ خیالات ذہن کے گوشوں سے کیڑے مکوڑوں کی طرح نکلنے لگے، ''فرانس میں سو سال پہلے وکٹر ہیوگو نے موت کی سزا کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ اس نے انسانیت کو جھنجھوڑ کر غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔''

''میں بھی سزائے موت کے خلاف جنگ لڑوں گا۔'' ذہن نے کرب سے دہائی دی۔

''میں موت کی سزا ختم کراؤں گا۔'' دکھ کی شدت نے مجھے بے حال کردیا تھا اور اب اس دکھ میں غصہ بھی شامل ہو رہا تھا۔

''مگر میں کیا کرسکتا ہوں؟'' مجھے اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگا۔

ہسپتال میں حسبِ معمول رش تھا۔ مریض ڈاکٹروں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور ڈاکٹر ڈھونڈے سے نہ ملتے تھے۔

میں عجلت میں تھا، ڈاکٹر کے کمرے کے دروازے پر کھڑے دربان کو ہاتھ کے اشارے سے اک طرف ہونے کا کہہ کر آگے بڑھا۔ وہ دروازے سے ہٹ گیا۔

شاید میرے لباس اور چال سے کوئی اہمیت ظاہر ہو رہی تھی۔ اسی لیے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اندر ڈاکٹر مریض کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔

میں نے ڈاکٹر کو سلام کیا، ڈاکٹر نے گردن ہلا کر جواب دیا اور معائنہ کرتا رہا۔

میں کرسی پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

کمرے میں ڈاکٹر کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ ایک مریضہ اور ایک

بوڑھا شخص۔ میں نے دوبارہ گردن گھما کر بوڑھے کی طرف دیکھا، کچھ دیکھا دیکھا سا لگا۔

میں اس کا چہرہ غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر اک عجیب سا تاثر تھا جسے کوئی عنوان نہ دے سکا۔ اس بوڑھے کو کہاں دیکھا ہے؟

کہاں دیکھا ہے؟

کہاں دیکھا ہے؟؟

کہاں دیکھا ہے؟؟؟

کچھ یاد نہ آیا۔

میں پھر اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اُترا ہوا چہرہ، آنکھوں میں کسی عمیق خیال کی گہرائی، پیشانی پر زمانے کے ڈھیروں مظالم چسپاں، گلے کی ہڈیاں ابھری ہوئی، جیسے کسی زیادتی کو برداشت کر کے چیخ ضبط کرنے کی کوشش میں منہ کو زور سے بند کرلیا ہو، سفیدی مائل داڑھی، کندھے جھکے ہوئے، جیسے کسی بڑے صدمے کے بوجھ سے جھک گئے ہوں، چہرے پر زندگی کی کوئی علامت...

مریضہ اک بوڑھی عورت تھی، جس کی صورت حسرت ویاس کی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ سادہ چادر، آنکھوں میں خوف جو کہ مستقل ٹھہر گیا تھا۔ اس کے دل کش نقوش میں بے بسی سما گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وقفے وقفے کے بعد خوف کی جگہ انتظار اور امید کی لہر لہراتی اور پھر خوف آ کر جگہ گھیر لیتا۔

یہ کون تھے؟ بوڑھا مجھے دیکھا بھالا کیوں لگ رہا تھا؟

ڈاکٹر نے بوڑھے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، ''یہ دوائیں استعمال کرائیں۔'' ڈاکٹر سے پرچہ لے کر بوڑھے نے لمبی لسٹ پر اک نظر ڈالی اور خالی خالی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا جن میں کوئی تاثر نہ تھا۔ ''مریضہ کو ہسپتال میں داخل کرادیں تو زیادہ بہتر ہوگا، دو تین ہفتوں میں بولنے لگے گی۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان تسلی بھرے الفاظ پر خود اسے بھی یقین نہیں تھا۔

''جی فرمایئے۔'' ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔

میں نے جیب سے لفافہ نکال کر ڈاکٹر کی طرف بڑھایا، ''چیف منسٹر ہاؤس میں کل شام پانچ بجے کا وقت طے ہے۔''

''حاضر سائیں۔'' ڈاکٹر نے خوش دلی کا اظہار کیا۔

بوڑھے نے جا کر مریضہ کو اسٹول سے اٹھایا۔ مریضہ کھوئی کھوئی بوڑھے کے سہارے اٹھی اور اس کا کندھا پکڑ کر چلنے لگی۔ اس عمل میں اس کا اپنا ارادہ شامل نہ تھا۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

ڈاکٹر نے گھنٹی بجا کر دربان کو طلب کیا۔

''اس کے بیٹے کو پھانسی ہوگئی ہے، بے چاری ابھی تک اس کا انتظار کر رہی ہے۔'' ڈاکٹر نے مجھے ان کی طرف متوجہ دیکھ کر کہا۔ شاید اس نے میرے چہرے پر ہمدردی کے جذبات دیکھ لیے تھے، ''بابا چائے لے آؤ''، ''سزا کے متعلق اسے پتا چل گیا تھا۔ اس وقت سے بے چاری کو چپ لگ گئی ہے۔ اسے ابھی یہ نہیں بتایا گیا کہ لڑکے کو پھانسی ہوگئی ہے۔ بس اب ساری عمر اسی طرح دکھوں کے سہارے اور انتظار کے ساتھ جیے گی۔ ہر گھڑی، ہر قدم دکھ اور انتظار کا ساتھ رہے گا۔'' ڈاکٹر تفصیل بتانے لگا۔

میرے ذہن میں کچھ یادیں پھرنے لگیں۔

''کیسے؟'' میں بس یہی کہہ سکا۔

''بس سائیں! نوجوان لڑکا تھا، اسپیشل ملٹری کورٹ نے پھانسی کی سزا سنا دی۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''بے چارے کی جوانی کا بھی خیال نہیں کیا!'' میں نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''لڑکا تو بڑا جی دار تھا۔ پھانسی کا پھندا چوم کر سولی چڑھ گیا۔'' ڈاکٹر کی آواز میں جوش پوشیدہ تھا، ''مگر اس کے ماں باپ کی حالت قابلِ رحم ہے، بس ایک ہی بیٹا تھا، زندگی کی آس اور سہارا وہی تھا۔ لاکھوں جتن کر کے اسے پڑھایا تھا۔''

''اب یہ بے چارے ہر گھڑی پھانسی چڑھتے ہیں، پھر زندہ ہوتے ہیں، پھر مرتے ہیں۔ یہ سزا انھیں مسلسل ملتی رہتی ہے۔ ہزار دفعہ— لاکھ دفعہ— مہینے بھر میں یہ عمر رسیدہ لگنے لگے ہیں۔'' ڈاکٹر نے تاسف سے کہا۔ اس کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔

میرے ذہن سے چیخیں نکلنے لگیں۔ پھانسی... پھانسی... ہینگ ہم ٹل ہی از ڈیڈ... ہینگ ہم... ہینگ ہم... ہینگ...

اب میں نے اس بوڑھے کو پہچان لیا تھا۔

اس نے دو مہینے پہلے رحم کی اپیل کی تھی۔ اس کی پریشانی نے اس دن مجھے بھی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اتنا ضعیف ہو گیا تھا کہ میں اسے پہچان ہی نہیں سکا تھا۔

کتنا کٹھن اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ امید اور مایوسی کی کش مکش نے ان کو برباد کر ڈالا تھا۔ آس اور انتظار نے انھیں زنگ کی طرح کھالیا تھا۔ ہر لمحہ برسوں سے طویل تھا۔ یہ دشوار سفر انھوں نے کیسے طے کیا ہوگا؟ یہ زندہ کیسے بچ گئے؟

ان پر رحم نہیں کیا گیا، ان کے بیٹے کو پھانسی دے دی گئی۔ لڑکے کا جرم تھا یا نہیں— اسے مارنا مقصد تھا سو پورا ہو گیا۔ اس کی زندگی ختم کر دی گئی مگر ان بے چاروں کو کس خطا کی سزا ملی تھی؟ انھیں جیتے جی کیوں مار دیا گیا ہے؟ یہ موت جو ہر پل کا ساتھ ہے، ان پر کس جرم کی پاداش میں دکھوں کے پہاڑ توڑے گئے ہیں؟ انھیں یوں تڑپایا کیوں جا رہا ہے؟

میرا سارا وجود خیالات کی تیز طوفان ہواؤں میں کسی سوکھے درخت کی ٹہنی پر لگے تنہا پتے کی طرح لرزنے لگا۔ میں نے کرسی کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ہینگ دیم— کل دیم— ہینگ دیم اگین اینڈ اگین ہینگ... ذہن میں ہتھوڑے چلتے رہے۔ میں نے اپنی گردن انکار میں ہلائی۔ آواز تیز ہوتی گئی، چوٹیں لگتی رہیں۔

سوکھے درخت کی ٹہنی پر موجود پتا تیز طوفانی ہواؤں کا سامنا نہ کر سکا تو کٹ گیا اور میں اک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ایسا نہیں ہوگا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ یہ ظلم ہے۔ کسی کو بھی اتنی سزا نہیں

ملنی چاہیے۔'' میں نے دانت بھینچ لیے۔

''یہ انصاف نہیں ہے... بند کرو یہ ظلم۔'' میں چیخ پڑا۔

ڈاکٹر مجھے حیرت کے ساتھ دیکھتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ کمرے سے باہر آکر میں ہسپتال کے بیرونی دروازے کی طرف دوڑنے لگا اور دوڑتا ہوا ہسپتال سے باہر آ گیا۔ وہ دونوں خالی روڈ پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اطراف کی دنیا سے بے نیاز دکھوں کی دنیا کے بے بس باشندے۔ دل کے قیدی ہر پل غموں سے گھائل ہو رہے تھے۔

کوئی امید نہ کوئی سہارا۔

میں نے تیزی سے کار کا دروازہ کھولا۔

کار چرچر کی تیز آواز کے ساتھ سڑک پر دوڑنے لگی۔ میرے ذہن میں حسرت و یاس کی یہ دونوں مورتیں گھومتی رہیں۔ زندہ لاشے جو کہ بار بار مر رہے تھے اور زندہ ہوئے بغیر پھر مر رہے تھے۔ وہ دونوں سامنے سڑک پر گھسٹتے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے متحرک جسم دھندلا گئے تھے یا پھر شاید میری آنکھوں میں پانی بھر گیا تھا۔ میرے ذہن میں ہتھوڑے چلنے لگے— ہینگ دیم— ہینگ دیم... میں نے دانتوں کو سختی سے بھینچا۔

یہ اذیت برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

کار تیز رفتاری کے ساتھ ان کے قریب تر ہوتی گئی...

یہ ظلم ہے... ہینگ دیم... ذہن چیختا رہا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے— اب وہ میرے بالکل سامنے تھے— میں نے ایکسیلیٹر پوری قوت سے دبا دیا...

جنگ

جمنازیم میں کوئی سیٹ خالی نہ تھی۔ شور شرابا اپنے عروج پر تھا۔ شاید لوگ شور کے بہانے اپنے اندر کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کررہے تھے۔ نعروں کی بڑھتی ہوئی آوازیں سن کر یہ کہا جاسکتا تھا کہ یہ لوگ اپنے اضطراب اور پریشانی کو کم کرنے میں کامیاب رہے تھے۔

نیشنل باکسنگ چیمپئن شپ کا یہ اہم راؤنڈ تھا جسے دیکھنے کے لیے تماشائیوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ علی بخش کو علم تھا کہ اس کے محلّہ دار اکبر، سرفراز، امام بخش سمیت کلاکوٹ کے سارے دوست انٹرنس کی طرف بیٹھے تھے۔ اس نے مڑکر اُدھر دیکھا، لوگ زیادہ تھے۔ کوئی بھی پہچانا نہیں جارہا تھا۔ ہجوم میں سب کے چہرے ایک جیسے لگ رہے تھے۔ وہ سب تماشائی ہی تو تھے جو اپنا کردار ادا کررہے تھے۔ اسے ان سے کوئی دوسری وابستگی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

''بھلا اور کیا تعلق ہے؟'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

استاد جمعہ نے کچھ کہا تھا، اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔

مقابلہ شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔

وہ ریڈ کارنر میں تھا۔

اس کے مقابل بینٹم ویٹ چیمپئن اور مشہور باکسر فواد تھا۔ مارننگ نیوز اور قومی

اخبارات نے نیشنل چیمپئن شپ کے لیے فواد کو فیورٹ قرار دیتے ہوئے لکھا تھا، ''وہ اچھے فارم میں ہے اور اپنے اسٹائل کی بدولت اسے دیسی فریزر کہا جاسکتا ہے۔ اس کے پنچ بھاری ہیں اور وہ اپنے لیفٹ ہک سے کسی بھی اچھے باکسر کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

علی بخش نے سر کو جھٹکا، اسے اپنے ذہن میں کھیل کی حکمتِ عملی تیار کرنی تھی۔ وہ ہر پہلو سے ناپ تول کے بعد کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے باکسنگ میں تقدیر کو کبھی بھی کوئی کردار نہیں سونپا تھا۔ وہ کسی بھی مقابلے کو نتیجے تک پہنچانے میں فارم اور پلاننگ کے بھرپور کردار سے واقف تھا۔ وہ اپنے آپ کو کسی بھی فضول وہم میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ فارم میں نہیں ہے۔ اس کا اسٹیمنا مطلوبہ حد سے بہت کم ہے۔ پریکٹس نہ ہونے کی وجہ سے مکوں میں بھی قوت نہیں آسکی ہے، اور نہ ہی پیروں میں وہ پھرتی ممکن ہے جو کسی اوّل درجے کے مقابلے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ وہ ان حالات کی وجہ سے ذہن میں پیدا ہونے والے فضول واہموں کو پرے دھکیل دینا چاہتا ہے۔ استاد جمعہ نے اس کے سر جھٹکنے کو اپنے مشورے سے انکار سمجھا۔

''آخر اس میں حرج کیا ہے؟— وہ گھوڑے کی طرح دوڑتا ہے تو دوڑنے دینا...'' اس نے جلدی جلدی کہا۔

علی بخش اپنے خیالات سے باہر آتے ہوئے بڑبڑایا، ''ٹھیک ہے استاد جمعہ! ٹھیک ہے۔'' اس نے ذہن پر زور دیا، وہ آخری دفعہ رِنگ میں کب اترا تھا۔

تقریباً سال بھر ہوچکا، گزشتہ نومبر میں تو ہوا تھا مقابلہ... اس نے یاد کیا۔ اس نے سدرن زون کی چیمپئن شپ جیتی تھی۔ اس وقت نیشنل چیمپئن شپ جتنا کوئی بڑی بات نہ تھی...'' اس نے ذہن میں حالات کا موازنہ کرتے ہوئے فیصلہ دیا۔

ریفری نے انھیں بلایا۔

علی بخش ریڈ کارنر سے نکلا، رِنگ کے درمیان پہنچنے تک جانے اسے کتنا عرصہ لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

دونوں باکسروں نے ہاتھ ملائے۔ ریفری نے ان کے گلوز چیک کیے اور وہ

واپس اپنے کارنر میں لوٹ آیا۔ اس نے فواد کو کھیلتا دیکھا تھا، اسے فواد کی کم زوریوں کا علم تھا، مگر وہ اپنے طاقت ور گھونسوں کی وجہ سے خطرناک تھا۔ علی اس بات سے بھی آگاہ تھا۔

''ارے علی بخش دھیان کدھر ہے؟ جلد بازی نہ کرنا۔'' استاد جمعہ نے اسے تاکید کی۔ گیارہ ماہ سے اس نے پریکٹس نہیں کی تھی۔ کام ہی اس قدر کرنا پڑتا تھا کہ وہ تھک جاتا، چاہتے ہوئے بھی پریکٹس نہیں کر سکا تھا۔ شروع میں اس نے دو چار دن پریکٹس کی لیکن اس کے نتیجے میں کئی بوریاں کنویئر پر رہ گئی تھیں۔ وہ زمین پر جاگری تھیں، جس کی وجہ سے اس کی مزدوری کاٹ لی گئی تھی۔

استاد جمعہ نے اسے کئی دفعہ پریکٹس کے لیے کہا تھا، لیکن وہ استاد کو کیسے بتاتا... وہ کنویئر پر بوریاں اتارتے ہوئے خواب بھی دیکھتا تھا۔ پینٹ اور نیک ٹائی میں وہ دیگر افسران سے زیادہ اسمارٹ دکھائی دیتا تھا۔ وہ کئی افسران کو ٹوک دیتا تھا۔ ان کے پھولے ہوئے پیٹ دیکھ کر اسے حیرت ہوتی۔ وہ کس قدر برے لگتے تھے۔ وہ صبح آفس میں ڈیوٹی کرنے کے بعد شام کو جمنازیم جاتا تھا۔ بڑے شوق اور محنت سے پریکٹس کیا کرتا، لیکن اس کے خواب ہمیشہ سپروائزر کی ڈانٹ کے باعث ادھورے رہ جاتے تھے۔

اگر وہ فواد سے یہ مقابلہ جیت گیا تو چیمپئن شپ جیت سکتا ہے۔ بینٹم ویٹ کلاس میں اتفاق سے اس کا دوسرا مقابلہ فواد سے ہی پڑ گیا۔ پہلے مقابلے میں اسے واک اوور مل گیا، ریلوے کا کھلاڑی سلیم ٹورنامنٹ میں آیا ہی نہیں تھا۔ پہلا میچ کھیلنے سے اس کی اچھی پریکٹس ہو جاتی، ویسے بھی سلیم ہلکے ہاتھ والا باکسر تھا۔

''سلیم بھی نہ آیا— سیدھا اس گھوڑے سے راؤنڈ پڑ گیا۔'' استاد جمعہ نے کہا تھا۔ اس نے پہلی گھنٹی کی آواز سنی۔

وہ جب رنگ کے درمیان پہنچا تو فواد اپنے کارنر سے نکلا۔ سدرن زون والے حامیوں نے جو انٹرنس کی طرف اکثریت میں تھے، زور زور سے نعرہ بازی شروع کر دی۔ وہ علی بخش کے کھیل سے واقف تھے۔

''اگر فواد نے عجلت کی تو موقع مل جائے گا... وگرنہ جلدی نہیں کروں گا۔'' علی

بخش نے اپنی حکمتِ عملی کو لفظوں میں دُہرایا۔

فواد اپنے کارنر سے بعد میں نکلا تھا، مگر درمیان میں وہ جلدی پہنچ گیا۔ فواد نے اس کے سامنے ہوتے ہوئے اسی پھرتی کے ساتھ لیفٹ اسٹریٹ، رائٹ، لیفٹ گھونسے چلائے۔ علی بخش تیار تھا، اس نے دایا مُکا کھول کر ہتھیلی سامنے کرتے ہوئے آنے والے گھونسے کو بلاک کیا۔ تھوڑا سا بائیں طرف سلائیڈ کرتے ہوئے فواد کے قریب ہوا، کندھے کو اوپر رکھتے ہوئے بازو گھمایا، کہنی کندھے کی سیدھ میں رکھتے ہوئے اس کے جبڑے پر گھونسا جمایا۔ اس کا وزن بائیں پیر پر تھا۔ ایڑی اٹھا کر اس نے یہ زور بازوؤں میں منتقل کیا تھا۔ بہت خوب صورت لیفٹ ہک پڑا تھا۔ فواد کے پاس اتنی مہلت ہی نہیں تھی کہ وہ خود کو بچا سکتا تھا، وہ تیزی سے آگے کو بڑھا تھا۔ اس کا بدن حرکت میں تھا اور وہ علی بخش کے گھونسے کے وار سے بچ نہیں سکا تھا۔

نعروں کی آواز بلند ہوگئی۔

علی بخش نے ایک لحظے کے لیے اکبر وغیرہ کو نعرے لگاتے دیکھا، مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اسے دایاں مُکا مقابل کی ٹھوڑی پر مارنا تھا۔

یہ دو گھونسے اکثر مقابلہ وقت سے پہلے ختم کرا دیتے تھے۔ علی بخش نے دائیں ہاتھ میں ساری طاقت سمیٹتے ہوئے گھونسا مارا۔ اسے یقین تھا کہ تین راؤنڈ کی تکلیف اور تکلف سے جان چھوٹ جائے گی۔

علی بخش کا گھونسا فواد کے کندھے پر لگا۔ اسے خود کو سنبھالنے کا موقع مل گیا۔ اس نے پیچھے کو ہٹتے ہوئے دو زوردار مُکے چلائے یہ مکے دفاعی تھے۔

علی بخش ان مکوں سے محفوظ رہا۔

اس نے پلٹتے ہوئے فواد کے قریب جانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ خود کو تھکانا نہیں چاہتا تھا۔ تین راؤنڈز کے لیے گھوڑے جیسے دم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس بات سے آگاہ تھا۔

فواد نے جب خود کو محفوظ جانا تو اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔ ذرا قریب ہو کر اس نے دو اسٹریٹ گھونسے مارے، وہ چاہ رہا تھا

کہ علی بخش جواب میں کوئی حرکت کرے تو اسے وار کرنے کا موقع ملے۔

علی بخش نے یہ چال سمجھتے ہوئے لیفٹ اسٹریٹ مُکا مارتے ہوئے پیر تھوڑا سا آگے بڑھایا۔ فواد کو گویا سگنل مل گیا۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے گھونسوں کی بھرمار کردی۔ علی بخش تیار تھا، وہ پیر پیچھے کو کھسکاتا رہا۔ فواد آگے بڑھتا رہا۔ علی بخش کبھی اوپر کے دھڑ کو ذرا پیچھے جھکا کر اور کبھی پیروں کو چند انچ پیچھے کھسکا کر ان گھونسوں سے محفوظ رہا۔

علی بخش نے دیکھا کہ فواد نے مُکے برساتے ہوئے گارڈ صحیح طریقے سے نہیں رکھا تھا۔ اس نے بایاں بازو سیدھا کیا— گھونسا فواد کے چہرے پر لگا۔

ویسے بھی علی بخش جذباتی طور پر ٹھنڈے مزاج کا باکسر تھا۔ اس نے رنگ میں ہمیشہ جذبات پر قابو رکھا تھا۔ اس وقت بھی حواس اس کے اختیار میں تھے۔ اس نے اپنا بایاں بازو سیدھا کیا۔ یہ گھونسا فواد کی پیشانی پر لگا۔ فواد نے گردن جھکائی، تھوڑی کو سینے پر ٹکایا، گلوز اور بانہوں سے خود محفوظ کرکے علی بخش کے قریب آتا گیا۔ علی بخش نے محسوس کیا کہ وہ مزید پیچھے کو نہیں جاسکتا، وہ کارنر پر پہنچ گیا۔

اس نے جان بوجھ کر اپنا چہرہ سامنے کیا، توقع کے عین مطابق فواد نے موقع دیکھ کر لیفٹ اسٹریٹ مارا۔ علی بخش یہی چاہتا تھا، اس نے چہرہ جھکا کر بائیں جانب جھٹکا دے کر ایک تیز قدم آگے بڑھایا، وہ فواد کے بہت قریب ہوگیا، دائیں، بائیں، دائیں بائیں، فواد کی پسلیوں پر چھوٹے چھوٹے مُکے (Jabs) مارکر، بایاں کندھا فواد کے جسم سے پرے رکھ کر، دایاں ہاتھ فواد کے سینے سے کھسکاتے ہوئے اسے زوردار گھونسا دے مارا۔ یہ اپرکٹ تھا، جس میں کافی چوٹ تھی۔ کیوں کہ مُکا مارتے وقت اس نے اپنی دونوں ٹانگوں کو سیدھا کرکے ساری قوت مُکے پر صرف کردی تھی۔

علی بخش نے دائیں جانب سے ہی فواد کے جوابی مُکوں سے بچایا تھا۔ فواد مضبوطی کے ساتھ کھڑا تھا، اس کی قوتِ برداشت پر علی کو حیرت ہوئی تھی۔

اس دوران لوگوں کے نعرے اور ہلڑ بازی جاری رہی، تماشائی مسلسل باکسنگ چاہتے ہیں— یعنی ایسا کھیل جس میں باکسر وقفہ نہ دے اور گھونسے برساتا رہے اور جلد از

جلد کھیل کو نتیجے پر پہنچائے۔ جب انھوں نے علی بخش کی پھرتی دیکھی تو اس کے ساتھ نعرے لگانا شروع کر دیے تھے۔ مگر وہ لوگوں کے اُکسانے پر زیادہ تیزی سے فواد کو گھونسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ فواد سخت جاں اور طاقت ور باکسر تھا، وہ پریکٹس میں بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں علی بخش فارم میں نہیں تھا، اسے کھیل چھوڑے سال بھر ہونے کو تھا۔ اس میں اتنا اسٹیمنا نہیں تھا کہ وہ فواد کو گرا سکتا۔ اس نے یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ فواد کو ناک آؤٹ نہیں کر سکتا۔ اسے موجودہ صورتِ حال میں صحیح فیصلہ کرنا تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ خود کو تھکائے بغیر پوائنٹس بھی اسکور کرتا رہے۔

گزشتہ مقابلوں میں جب اس نے سدرن زون کی چیمپئن شپ جیتی تھی تو اس وقت وہ بہترین فارم میں تھا۔ سب کا یہ خیال تھا کہ وہ نیشنل ٹائیٹل جیتے گا۔ نیشنل چیمپئن شپ سیاسی گڑبڑ کے باعث چار ماہ کے لیے التوا کا شکار رہی اور وہ پریکٹس جاری نہ رکھ سکا۔ حالاں کہ اس نے سخت محنت کی تھی۔ یہ محنت باکسنگ کی محنت سے مختلف تھی۔ یہ محنت پیٹ کے لیے تھی، زندگی کے لیے تھی۔ اس محنت سے چار زندگیاں وابستہ تھیں۔

یہ شوقیہ محنت نہیں تھی، زندگی کے لیے تھی جس کی اجرت ذہنی اطمینان کی صورت میں ملتی ہے۔ جو محنت اس نے کی تھی، اس کا معاوضہ نقدی کی شکل میں ملتا ہے اور نقدی سے مطلوبہ آٹا خریدا جا سکتا ہے۔ دُکان دار کا قرض چکایا جا سکتا ہے۔ ناراض مالکِ مکان کے بقیہ کرائے کی قسط ادا کر کے راضی کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ رشید کو کتابیں، کاپیاں دلائی جا سکتی ہیں۔ علاج کرایا جا سکتا ہے۔

پیسا تو کئی کام کر سکتا ہے مگر افسوس کہ مزدوری کی اجرت اتنی نہیں ہوتی ہے کہ اس سے کئی کام لیے جا سکیں، ہاں البتہ یہ اُجرت اس قدر ضرور ہوتی ہے کہ اسے زندہ رکھتی ہے، پھر اگلے دن مزدوری کے لیے بندرگاہ پر لے آتی ہے۔

وہ مزدوری کے اس اذیت ناک چکر سے نکلنا چاہتا ہے، وہ پریکٹس کرنا چاہتا ہے۔ اپنے وجود کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اتنے برسوں کی محنت کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ روزانہ گودی کی طرف جانا نہیں چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس

چکی میں آہستہ آہستہ پستا رہے اور اپنی شناخت کھو بیٹھے۔ حسرتوں اور خواہشوں کے انبار تلے دب کر کچلتا رہے۔

علی بخش کے باپ کے گھٹنے میں تکلیف بڑھ گئی، وہ گودی پر مزدوری کے لیے نہ جاسکا۔ اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ جہاز سے گندم اور سیمنٹ اتار سکے۔ گھٹنے پر چوٹ تو اسے آٹھ سال پہلے لگی تھی، جب وہ گورنمنٹ پریس کی طرف سے فٹ بال کا فائنل میچ کھیل رہا تھا۔ وہ اپنے دور کا بہترین کھلاڑی تسلیم کیا جاتا تھا۔ چوٹ لگنے کے بعد غربت کے ساتھ ساتھ گُم نامی بھی اس کا مقدر بن گئی۔ وہ کھیلنے کے قابل نہ رہا۔ اس نے علاج کے لیے بہتیرے جتن کیے۔ ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے چکر کاٹتے کاٹتے دل برداشتہ ہوگیا۔ اس نے مہنگے ڈاکٹر بھی نہ چھوڑے تھے۔

یہ آٹھ سال علی بخش کے ذہن پر نقش تھے۔ جب اس کا باپ کسی مہنگے ڈاکٹر کے پاس جاتا تو اس کا مطلب ہوتا سب گھر والوں کا دو دن کا فاقہ — بھوک۔ ان آٹھ سالوں میں اسے فاقوں کی عادت ہوگئی تھی۔ وہ مذاق میں فاقے کو ڈائٹنگ کہتا تھا۔

علی بخش کا باپ مولا بخش اس حالت میں بھی بندرگاہ پر مزدوری کرتا رہا۔

علی بخش نے پھرتی کے ساتھ بایاں بازو سیدھا کیا، یہ گھونسا فواد کے چہرے پر پڑا۔ فواد نے ہاتھ اوپر کر کے چہرہ چھپایا، وہ ایسے دوسرے گھونسے سے بچنے کے لیے تیار تھا۔ دایاں گھونسا اس کے چہرے پر لگنا، اس کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ علی بخش نے دایاں ہاتھ نیچے کو گھما کر فواد کے پیٹ پر وار کیا۔

باپ کی تکلیف بڑھ جانے کے بعد گھر کی ذمے داریاں علی بخش پر آن پڑیں۔ وہ مزدوری کرنے لگا۔ چار ماہ کے بعد نیشنل چیمپئن شپ منعقد ہوئی مگر وہ اس میں حصّہ نہ لے سکا۔ وہ پریکٹس میں نہیں تھا۔

علی بخش نے سوچ رکھا تھا کہ وہ آئندہ چیمپئن شپ میں بھرپور تیاری کے ساتھ حصّہ لے گا۔

اس کے باپ کی تکلیف کم نہیں ہوئی۔ وہ کلب واپس نہ جاسکا۔ اس دوران اس

نے نوکری کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کی۔ جب وہ سرٹیفکیٹ لے کر نوکری کی تلاش میں مختلف دفاتر میں جاتا تو اسے خود پر فخر ہوتا۔ وہ ایک اچھا باکسر تھا، اس کا مستقبل روشن تھا۔ مگر کچھ عرصے بعد سرٹیفکیٹ ہمراہ لے کر جانا، اسے یوں لگتا گویا ہاتھ میں سرٹیفکیٹ نہیں بلکہ کشکول ہو اور وہ بھیک مانگنے نکلا ہو۔

اس خیال کے ساتھ ہی اُس نے دانت بھینچ کر دائیں، بائیں دائیں ہاتھ کے گھونسے فواد کو مارے۔ نعروں کی آواز بلند ہوئی۔ اس کا سانس بھی تیز چلنے لگا۔

اسے نوکری نہ ملی۔

اس تکلیف دہ تصور پر اس نے اپنے پورے بدن میں تھکاوٹ کو لہو میں گردش کرتا ہوا محسوس کیا۔

اس نے کتنی مسافتیں طے کی تھیں۔

خون، سارے جسم کی تھکاوٹ بن کر ٹانگوں کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ کہاں کہاں نہ گیا تھا۔ اِس بار نیشنل چیمپئن شپ میں اُس نے اِس امید کے ساتھ حصّہ لیا تھا کہ ٹائٹل جیتنے سے نوکری ملنے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

مینجنگ ڈائریکٹر نے بھی یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ نیشنل چیمپئن کو نوکری دینے کے لیے تیار ہے۔

اسے بس ٹائٹل چاہیے۔ اسے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ وہ اچھا باکسر ہے یا نہیں۔ علی بخش کی قابلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے تو صرف نیشنل چیمپئن چاہیے، تاکہ وہ اس سرٹیفکیٹ سے فائل کا پیٹ بھر سکے۔

''بے شک فائلیں جذبات سے عاری ہوتی ہیں۔ یہ کسی کی اہلیت، ضرورت اور مجبوری جاننے کی کوشش کیوں کریں؟'' علی بخش نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔

اس کا مقابلہ فواد سے نہیں تھا۔ اس کی جنگ بے جان اور سرد فائلوں سے تھی۔

بعد کے دو مقابلے قطعی غیر اہم تھے۔ فواد سے جیتنے کے بعد اس کی نوکری پکی تھی۔

فواد کے بائیں ہاتھ کے زوردار گھونسے سے بچنے کے لیے، چہرے کو تھوڑا سا

دائیں طرف کو جھکاؤ دے کر اس نے اپنا دایاں گھونسا فواد کے پیٹ پر مارتے ہوئے بایاں ہک فواد کے چہرے پر مارا۔

وہ کچھ جذباتی ہوگیا تھا۔ اس نے خود کو روکا، راؤنڈ ختم ہونے کی گھنٹی اس نے سن لی تھی فواد کو رِنگ کے درمیان چھوڑ کر واپس اپنے کارنر کی طرف آ گیا۔ استاد جمعہ نے اسٹول رکھا تو علی بخش اس پر بیٹھ گیا۔

تولیے سے اس کا چہرہ پونچھ کر استاد جمعہ نے اس کی رانیں دبانا شروع کردیں، پٹھے اکڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دباتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ علی بخش کو سکون محسوس ہوا۔ کنویئر (Conveyer) سے بوری اتارنے کے لیے اسے جھک کر کھڑا ہونا پڑتا تھا، رانوں کو یہ عادت ہوگئی تھی۔ ہاتھوں کی تیز حرکت کی وجہ سے رانوں کو زیادہ کام کرنا پڑا تھا، جس کی نوعیت مختلف تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ راؤنڈ کے دوران اس کی ٹانگیں تھک جائیں۔

استاد جمعہ نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اس نے پہلے راؤنڈ میں عمدہ کھیل پیش کیا تھا اور کافی پوائنٹ اسکور کیے تھے۔ استاد نے اسے جارحانہ کھیل کھیلنے کی ہدایت کی لیکن علی بخش سوچنے لگا کہ اس نے ہر دفعہ دو دو یا تین مکوں کے کامبینیشن سے زیادہ مکے مارنے کی کوشش کی تو فواد کو قریب آنے کا موقع مل جائے گا۔ فواد جسمانی طور پر مضبوط باکسر تھا اور نزدیک کا کھیل میں سخت نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔

علی بخش کو اپنی پریکٹس کی کمی کو مدِنظر رکھنا تھا۔

وہ خواہ مخواہ کسی لاحاصل خوش فہمی میں مبتلا ہوکر اپنا نقصان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس مقابلے سے اس کا مستقبل وابستہ تھا۔ فواد کی سخت جانی کا ثبوت اسے مل چکا تھا۔ علی بخش نے استاد جمعہ کی تسلی کے لیے گردن اقرار میں ہلائی۔ وہ نوکری کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اسے نوکری ملنے کی راہ میں محض دو راؤنڈ حائل تھے۔

وہ اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا، رسّی سے ٹیک لگا کر دو تین دفعہ ٹانگیں جھٹک کر رانوں کے پٹھوں کو لچک دی۔ اسٹول اٹھالیا گیا۔ گھنٹی بج گئی۔

اس بار علی بخش نے جلد بازی نہیں کی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ درمیان میں آیا۔

دونوں نے اپنے اپنے دفاعی گھونسے چلائے تاکہ دوسرا عجلت کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ دونوں کے گلوز ٹکرائے۔

فواد نے مُکے مارنا شروع کیے، شاید وہ حساب برابر کرنا چاہتا تھا۔ علی بخش اپنے تیز فٹ ورک کے باعث فواد کی پہنچ سے دور رہا۔ وہ موقعے کی مناسبت سے مُکا بازی بھی کرتا رہا۔

مسلسل دھکوں اور پٹائی کی وجہ سے فواد جوش میں آ گیا تھا۔ اس نے گھونسے مارتے ہوئے تیزی کے ساتھ قدم آگے بڑھائے، اس کا چہرہ ظاہر ہو رہا تھا۔ علی بخش مُکا مارنے کے بعد پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ فواد نے دائیں بازو کو چہرے کے سامنے کر کے اس کو محفوظ کرتے ہوئے قوت کے ساتھ پیٹ میں مُکا مارا۔ علی بخش نے دائیں کہنی سے آنے والے مُکے کو ڈھال دی۔ کمر سے نچلے دھڑ کو موڑ دیتے ہوئے کندھے کو اوپر کر کے بائیں ہاتھ سے فواد کے جبڑے پر مُکا مارا۔

سائیڈ سے پڑنے والے طاقت ور گھونسے نے فواد کو ہلا کر رکھ دیا، وہ ڈگمگایا۔ علی بخش نے آگے بڑھ کر فواد کے چہرے پر دایاں گھونسا مارنے کی کوشش کی، لیکن فواد نے اس کو اپنے بازو سے روک لیا۔ وہ اب گلوز اور بازوؤں سے خود کو چھپا کر وار کرنے کے لیے تیار تھا۔ علی بخش نے اپنے دائیں بازو کو واپس گارڈ میں لانے میں تاخیر کی، وہ فواد کو حملہ کرنے پر اُکسا رہا تھا۔

فواد نے اس کے چہرے پر بایاں گھونسا مارا۔ علی بخش نے ہیڈ گلانس کر کے آگے بڑھتے ہوئے بائیں بازو کی کہنی کو فرش کے زاویے پر لا کر ٹانگوں سے جھکاؤ دے کر سیدھا ہوتے ہوئے ایک مُکا مارا، اپرکٹ فواد کی ناک پر لگا، اس دوران فواد نے دو تین مُکے (Jabs) علی بخش کے پیٹ پر مارے تھے، لیکن علی بخش کا وار زوردار تھا۔ فواد کی ناک سے لہو بہہ نکلا مگر وہ مضبوط تھا۔

''بریک!'' ریفری نے کھیل روکا اور فواد کو وائیٹ کارنر میں لے آیا۔ تولیے سے اس کا چہرہ صاف کر کے واپس رنگ کے درمیان لایا۔

''باکس!'' ریفری نے انھیں کھیل شروع کرنے کا اشارہ کیا۔

دوسرے راؤنڈ میں بھی فواد نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی، وہ زیادہ قوت سے گھونسے مار رہا تھا، علی بخش اس کے ہاتھوں کی پہنچ سے دور رہا۔ اس نے اوپر کے دھڑ کو پیچھے جھکا کر خود کو گھونسوں سے محفوظ رکھا تو کبھی اپنے پیروں کو پھرتی کے ساتھ پیچھے سرکاتے ہوئے فواد کو اپنی طرف کے رنگ میں پھرایا۔

اس راؤنڈ میں علی بخش کے بازوؤں اور پیٹ پر فواد کے گھونسے لگے تھے۔

اسٹریٹ لیفٹ بلاشبہ باکسنگ کا بنیادی اور خوب صورت مُکا ہے، علی بخش کو اس پر قدرت تھی۔ پیٹر جیکسن کی طرح اس کا بھی اسٹریٹ لیفٹ نہایت تیز اور خوب صورت تھا۔ اس نے جس آسانی کے ساتھ فواد کے چہرے پر اسٹریٹ لیفٹ مُکے اپنی مرضی کے مطابق مارے تھے، اس سے تماشائیوں میں بھی جوش پیدا ہوا تھا۔

حریف کو مخصوص مُکے مارنے پر اُکسانا، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وار کرنا، ایک جگہ پر کھڑے کھڑے اوپر کے دھڑ کو جھکا کر وار خطا کرنا اور پھرتی کے ساتھ گھومتے ہوئے مقابل کو کھلا کھلا کر تھکانا، علی بخش کے کھیل کی خوبیاں تھیں، وہ کندھے کو جھٹکا دے کر فواد کے جوشیلے اور طاقت ور مُکوں سے خود کو بچا کر اِدھر اُدھر ہوتا رہا اور موقع ملتے ہی فواد کے چہرے پر گھونسے مارتا رہا۔

فواد کا چہرہ سوج گیا تھا اور لہو میں رنگ جانے کی وجہ سے مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

تماشائی علی بخش کو اُکسانے کے لیے نعرے لگاتے رہے۔ لیکن علی بخش نے مزید تیزی نہ دکھائی۔ اس نے ایک قدم اور نہیں اٹھانا تھا۔ اب اسے اپنا بایاں ہاتھ قدرے بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ بوری کھینچ کر سینے تک لانا، سائیڈ کو دھکا دینا— پورے آٹھ ماہ تک— اس کے پٹھوں کی عادات بدل گئی تھیں۔ اب اسے گھونسے مارنا مختلف سا لگ رہا تھا۔

استاد جمعہ کس طرح پریکٹس کے لیے اصرار کرتا رہتا تھا مگر اس کے لیے مزدوری سے چھٹی کرنے کا مطلب تھا سارے گھرانے کے لیے ایک اور فاقہ، باپ کی تکلیف میں اضافہ... اسے یہ مقابلہ جیتنا تھا...

تاکہ اسے نوکری ملے اور وہ پریکٹس کرے، اپنے کھیل کو مزید بہتر بنائے۔ گھر والوں کی روٹی محفوظ کرے۔ درد کی چیخیں گھٹا کر، علاج کرائے۔ کھیل کھیلے۔ وہ خوف ناک فاقے روکے، جن کی وجہ سے گھر والوں کو نیند نہیں آتی تھی، وہ اپنی بیداری چھپانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ دوسروں کو دُکھ نہ پہنچے۔

اس کے ذہن میں یہ خیالات گردش کررہے تھے۔

راؤنڈ ختم ہونے والا تھا۔ اسے ہمیشہ وقت کا احساس رہتا تھا۔ اس نے ٹائم کیپر کو اسٹاپ واچ کو دباتے ہوئے دیکھا... وہ فواد کو چھوڑ کر مڑنے کے لیے تیار ہوا۔ فواد کو موقع مل گیا، گھنٹی بجی— لیکن عین اسی لمحے فواد کا بایاں گھونسا اس کے جبڑے پر لگا۔ علی بخش گردن جھکا کر واپس آنے کو تھا، جب اسے یہ گھونسا لگا، اس کا دماغ چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے رِنگ کے کارنر گھوم گئے۔

استاد جمعہ نے اسے رِنگ کے درمیان سے لاکر اسٹول پر بٹھادیا اور سر کی مالش کرنے لگا۔ وہ حسبِ عادت بولتا بھی رہا۔ رانوں کے پٹھے بھی اکڑے ہوئے تھے۔ اس نے ان کی مالش شروع کردی۔

''بایاں بازو شل ہوگیا ہے۔'' علی بخش نے بایاں بازو اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

استاد جمعہ رانوں کو چھوڑ کر بازو دبانے لگا۔

استاد جمعہ اپنی ماہرانہ رائے دے رہا تھا۔

علی بخش کا ذہن کسی اور طرف تھا، ماضی میں پڑنے والی مصیبتوں اور مشکلات کا سایہ اس کے حال پر پڑ رہا تھا۔ وہ کوشش کرتا رہا تھا کہ یہ سایہ بڑھنے نہ پائے۔ مبادا یہ سایہ بڑھ کر اس کے مستقبل پر جاپڑے۔

اس کے جسم میں لرزش پیدا ہوئی۔ شاید ذہن کے پردے پر کوئی خوف ناک سایہ آ گیا تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا، اسٹول ہٹادیا گیا۔ تیسرے اور فائنل راؤنڈ کے آغاز کی گھنٹی

بجی۔ فواد تیزی کے ساتھ رِنگ کے درمیان پہنچ گیا تھا۔ علی بخش محتاط انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ لوگوں کا شور بڑھنے لگا۔ اب ان کی توقعات بڑھ گئی تھیں۔ وہ نام لے کر، کلر سے پکار کر اپنی پسند کا اظہار کر رہے تھے۔

فواد نے مُکا بازی شروع کی۔ وہ تیزی سے دفاع کر کے خود کو بچا نہیں پا رہا تھا۔ زیادہ تر مکے گلوز پر روکتا رہا۔ بایاں مُکا فواد کے چہرے پر لگتا رہا، اب اس میں رہی سہی طاقت بھی ختم ہوگئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ لیفٹ اسٹریٹ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سے کسی بھی قریب کے فائٹر کو مسلسل پرے رکھا جاسکے۔ آخرکار وہ اپنی جگہ بنالے گا اور آ کر نقصان پہنچائے گا۔

علی بخش نے مار کھانا شروع کی۔ پہلے تو یہ بات ظاہر نہ ہوئی، لیکن آہستہ آہستہ عیاں ہونے لگی۔ مجمعے کا شور دھیما پڑ گیا تھا۔ یہ سب کچھ ان کی توقعات اور اندازوں کے برعکس ہونے لگا تھا۔ پہلے فواد کے گھونسے علی بخش کو نہیں لگ رہے تھے لیکن اب یہ خطا نہیں جا رہے تھے۔ علی بخش سینے اور پیٹ پر کافی مار سہ چکا تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ فواد کو خود سے پرے رکھے اور چہرے پر مار نہ کھائے۔ بایاں بازو شل ہو چکا تھا۔ ٹانگوں سے بھی پھرتی جاتی رہی تھی۔ وہ ڈھیلا پڑ چکا تھا۔

علی بخش کا وزن اپنی کلاس کی بالائی حد سے کم تھا۔ اس کے لیے وزن بڑھانا ضروری تھا۔ وہ کم زور لگ رہا تھا، استاد جمعہ نے گزشتہ ماہ خوراک شروع کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے ڈھائی سو روپے بچا کر رکھے اور استاد سے خوراک کی تفصیلات پوچھ لی تھیں، لیکن وہ خوراک کھا نہیں سکا تھا۔

سارس کا تیل پرانے درد کے لیے اکسیر سمجھا جاتا ہے، خاص طور پر جوڑوں کے درد اور چوٹ والے درد کے لیے۔ مولا بخش بھی جب ڈاکٹروں سے مایوس ہوگیا تو سارس کے تیل کے معجزاتی کرشمات کی داستانیں اسے متوجہ کرتی رہیں، وہ کافی عرصے سے اس کی ٹوہ میں تھا۔ بہتیرا تلاش کیا مگر اسے کہاں ملتا تھا۔

عیسیٰ نے کافی عرصہ پہلے وعدہ کیا تھا کہ جب موسم آئے گا تو وہ سارس کا تیل

لاکر دے گا۔ گزشتہ ماہ وہ آیا تو علم ہوا کہ سونمیانی عیسو نے سارس شکار کیا تھا۔ اس نے وڈیرے بنگل کو پانچ سو روپے کے عوض دے دیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ رعایت کرنے کو تیار تھا، مگر رقم پیشگی طلب کر رہا تھا۔ علی بخش نے تین سو روپے جمع کر کے عیسیٰ کو دیے تھے۔

وہ کم زوری محسوس کر رہا تھا۔ رِنگ آہستہ آہستہ گول دائرے میں گھوم رہا تھا۔

''راؤنڈ ختم ہونے تک کھڑا نہیں رہ سکوں گا۔'' اس نے دُکھ کے ساتھ سوچا۔ ٹانگیں ڈگمگا گئی تھیں۔ حرکت کرنا دشوار ہو رہا تھا، مگر ثابت قدم رہنا لازم تھا۔ وہ اپنی باقی ماندہ قوت کو جمع کر کے قوتِ ارادی کو مضبوط رکھتے ہوئے، سمجھ داری کے ساتھ دفاعی کھیل کھیلتا رہا۔

بایاں بازو شل تھا، وہ دائیں بائیں ہاتھ سے مُکے روکتا رہا تھا۔ اب وہ پہلے راؤنڈ کی طرح پیروں کو استعمال کرتے ہوئے بچاؤ کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ تھکی ہوئی ٹانگوں سے یہ کام لینا ممکن نہیں تھا۔ اب تو اسے آخری لمحے تک کھڑے رہنا تھا۔ دونوں راؤنڈز میں اس کے پوائنٹ زیادہ تھے۔

وہ وقت گزار رہا تھا۔ اس نے ساعتیں شمار کرنا شروع کیں۔

ڈھائی منٹ پورے ہو چکے تھے... باقی تیس سیکنڈ...

فواد نزدیک ہوا۔ علی بخش نے بایاں گھونسا مارا جو فواد کے چہرے پر لگا، لیکن وہ پیچھے نہ ہٹا، وہ مُکے مارتا ہوا آگے بڑھتا رہا، علی بخش دونوں بازوؤں اور گلوز سے گارڈ رکھتے ہوئے پیچھے کو رکنے لگا۔ ٹانگیں کپکپا رہی تھیں، اسے خوف تھا کہ وہ گر نہ جائے۔

''اپنے اوپر قابو رکھو بس!'' استاد جمعہ کی آواز اس کے دل کی پکار سے جا ملی۔ وہ پیروں پر گھوم کر فواد کی دائیں بغل سے نکل کر رِنگ کے درمیان پہنچ گیا۔ اس تیزی کی وجہ سے اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔

''باقی دس سیکنڈ...'' علی بخش بڑبڑایا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا یہ اندازہ درست ہوگا۔

علی بخش کے یوں بچ نکلنے پر فواد کا طیش بڑھ گیا۔ وہ تیزی سے رُخ بدلتا ہوا رِنگ کے درمیان پہنچا اور علی بخش کو تیز تیز مُکے مارنے لگا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس کے ہانپنے

کی آواز کسی جانور کی طرح تھی۔

علی بخش نے آنے والے مُکّوں کو بائیں ہاتھ سے ترچھا کیا۔ درد کی لہر کندھے تک محسوس ہوئی، اس نے دایاں ہاتھ سامنے کیا، یہی موقع تھا۔ علی بخش کا چہرہ ظاہر ہوا، فواد نے ہاتھ ایک طرف کرتے ہوئے ایک زور دار ہُک علی بخش کے چہرے پر مارا۔

علی بخش کی کپکپاتی رانیں، جھومتے جسم کا وزن سہار نہ سکیں، اس کے گھٹنے اور ہاتھ کینوس پر جا لگے۔

اس نے رنگ کو اپنے چاروں طرف گھومتا ہوا محسوس کیا۔ وہ ریڈ کارنر ڈھونڈنے لگا۔ استاد جمعہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ گویا کسی جھولے میں جھول رہا ہو۔

ریفری نے سات گنا، استاد جمعہ نے ہاتھ سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

علی بخش نے ہاتھوں پر زور دیتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی...

بائیں سے اور، بازو دُہرا ہوگیا...

مینجنگ ڈائریکٹر کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے، ''نیشنل ٹائٹل... نیشنل ٹائٹل... مستقبل، گھر والوں کی روٹی، باپ کا علاج... پس منظر میں تھے...

ناک آؤٹ نہیں ہونا ہے...! دماغ نے فیصلہ سنایا۔

اس نے ہمت کر کے ہاتھوں پر زور دیا، اوپر کو اٹھنے لگا... بائیں پیر کو کینوس پر جما کر اس پر وزن لیتے ہوئے کھڑا ہونے کے لیے سیدھا ہونے کی کوشش کی...

رانوں کے بے حال پٹھے درد سے پھڑکنے لگے... درد کی شدید لہر اٹھی...

تکلیف برداشت سے باہر تھی، جیسے رانوں میں الاؤ جل رہا ہو... وہ کینوس پر گر گیا۔

سزا

ریل میں جگہ ملنا ممکن نہیں تھا، چھت پر بھی کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے پلیٹ فارم کے دو چکر لگائے۔ اک ڈبے میں جگہ ملنے کی ذرا سی امید دکھائی دی، بوگی بھری ہوئی تھی۔ سیٹوں پہ بیٹھے مسافروں کے علاوہ بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ فرش پہ ہی بیٹھ گئے تھے، جن میں بڑی تعداد بھکاریوں اور فقیروں کی تھی۔

اس نے اپنا سامان بان کے بنے ہوئے تھیلے میں، اک گٹھڑی اور بڑے بیگ میں ٹھونس کر چاروں اطراف دیکھا۔

اگر اسے کسی واقف شخص کی تلاش مقصود تھی تو اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تھی۔

مسافروں کی بڑی تعداد دیہاتیوں کی تھی، دیگر مسافر مخلوط تھے۔ چند طلبہ تھے تو کچھ شہری جن میں بنیے، دکان دار دور سے ہی الگ دکھائی دے رہے تھے۔ چند ایک مسافر سرکاری ملازم لگ رہے تھے۔ اس قدر بھیڑ کے باوجود وہ اخبار پڑھنے میں محو تھے۔ گداگر اور دیوانے نہایت ایمان داری کے ساتھ اپنا کام کر رہے تھے، جن کے فن پر مسافر داد دیتے ہوئے قربان ہوئے جا رہے تھے۔

اس نے بھی وقت گزارنے کی خاطر گنڈیریاں خریدیں اور بنا کچھ سوچے قریبی سیٹ پر بیٹھے مسافر کی طرف ہاتھ بڑھا کر گنڈیریاں پیش کیں۔ مسافر جو پندرہ سولہ برس کا نوجوان معلوم ہوتا تھا، اس نے ایک گنڈیری اٹھا کر مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔

آدم نے گنڈیریاں چوسنا شروع کیں۔ وہ اس نوعیت کے سفر پر پہلی بار جا رہا تھا۔ اس کی جائے پیدائش تو کوئی اور تھی مگر تعلیم حیدرآباد میں پائی تھی۔ اب ملازمت بھی یہیں تھی۔ سفر کا تصور کرتے ہی اس کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ ذہن کی کھڑکیوں میں اپنے من چاہے نظارے کرتا ہوا گنڈیریاں چوستا رہا۔ دفعتاً کوئی خیال آنے پر اس نے چونک کر گنڈیریوں کی تھیلی نوجوان کی طرف بڑھائی۔

اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کچھ عجیب سا دکھائی دے رہا تھا۔ سر کے بال قدرے لانبے تھے۔

گارڈ نے سٹی بجائی تو گاڑی چلنے لگی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ دوڑ کر گاڑی میں سوار ہونے لگے اور گاڑی کے اندر بھیڑ میں مزید اضافہ ہوگیا نوجوان سنگل سیٹ پہ بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے گھٹنے سکیڑ کر قریب کھڑے آدم کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

''نہیں آپ کو تکلیف ہوگی، بس میں کھڑا ہی رہتا ہوں۔''

''نہیں سائیں، کاہے کی تکلیف۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا، ''ویسے بھی سفر کا مطلب ہی تکلیف ہے۔'' لڑکے نے اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ ہوتے ہوئے دوبارہ کہا، ''آپ تشریف رکھیں، طویل سفر ہے، کب تک کھڑے رہیں گے۔'' آدم اس قدر سنجیدگی کے سامنے کچھ بھی نہ کہہ سکا اور نوجوان کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' آدم نے محض بات کرنے کی خاطر سوال کیا، وہ خود کو کافی زیر بار محسوس کر رہا تھا۔

''آثم! آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟''

''میں آدم ہوں!'' اس نے مزید بھی کچھ کہنا چاہا مگر گنڈیری چوسنے کی وجہ سے اپنے ارادے سے باز رہا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''سیہون شریف جا رہا ہوں۔ آپ بھی غالباً اُدھر ہی جا رہے ہیں؟''

''ہاں میں بھی میلے میں جا رہا ہوں۔''

ریل کی رفتار تیز ہوگئی تھی اور ہچکولے بھی بڑھ چکے تھے، نعروں کا شور بھی ٹوٹ گیا تھا۔

آدم نے اپنا وزن سہارنے کے لیے بائیں پاؤں پہ دباؤ ڈالا اور دایاں بازو اُٹھا کر سیٹ سے ٹکاتے ہوئے خود کو ایڈجسٹ کیا۔ نوجوان نے سمٹتے ہوئے اسے اپنی طرف سرکنے کو کہا۔

''مجھے پہلی بار جانے کا اتفاق ہو رہا ہے۔ سنا ہے کہ میلے میں بہت مزہ آتا ہے۔'' آدم نے پُرامید لہجے میں اپنے دل میں پیدا ہونے والے وسوسے چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے دفتر سے تین دن کی رخصت لی تھی۔ البتہ وہ آخری وقت تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ میلے میں جائے یا کراچی کا چکر لگا آئے۔

''مزہ تو میلے پہ بہت آتا ہے۔ دیکھیں اس بار کیسا رہتا ہے۔'' آثم نے جواب دیا۔ کچھ سوچ کر وہ پھر کہنے لگا، ''محفلِ موسیقی تو ہوتی ہے مگر لوگ بھی دیس دیس سے آتے ہیں۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''کیا مطلب؟ کون لوگ آتے ہیں؟''

''مطلب کہ رنگ رنگ کی صورتیں جمع ہوتی ہیں۔ ایک طرف سے لوگ بڑی تعداد میں آتے ہیں— ان میں عورتوں کی اکثریت ہوتی ہے۔'' آثم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لہجے میں شرارت کی آمیزش آدم سے چھپ نہ سکی۔

''ان کے علاوہ؟'' آدم نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

''ان کے علاوہ حسن کا کاروبار ہوتا ہے۔''

''فقرا، درویش بھی آتے ہوں گے؟'' آدم نے عجلت میں سوال کیا۔

''ملنگ، فقیر، مست، سنیاسی ہمہ اقسام کے لوگ آکر ڈیرے ڈالتے ہیں۔ کچھ لاہوت جانے کی تیاری میں ہوتے ہیں تو کچھ لال باغ میں بیٹھے چلہ کاٹتے ہیں...''

لاہوت کیا ہے؟'' آدم نے پہلو بدل کر دایاں بازو سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

''لاہوت لامکان؟''

''ہاں!''

لاہوت لامکان اک زیارت ہے جہاں ملنگ اور فقرا میلہ ختم ہونے کے بعد پیادہ پا جاتے ہیں۔''

آثم نے اپنا بایاں بازو اٹھا کر آدم کی گردن پر رکھ کر بازو کا دباؤ ڈالتے ہوئے آدم کو سہولت سے بیٹھنے کا اشارہ کیا، کیوں کہ وہ سیٹ کے کونے پر بیٹھا تھا اور ہر ہچکولے پر اپنے بائیں پیر پر وزن ڈال کر خود کو سیٹ پر سے گرنے سے روک رہا تھا۔

''... یہ جگہ بلوچستان میں واقع ہے۔ جہاں حضرت علیؓ کے قدمِ مبارک ہیں... دوسری زیارتیں بھی ہیں۔''

''لاہوت کتنے فاصلے پہ ہوگا؟''

''چار پانچ دن کا راستہ ہے۔''

وہ باتیں کرتے رہے۔ آدم کو تسلی ہوگئی کہ آثم سیہون شہر کی بابت جانتا ہے، لہٰذا اسے وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

ان کا سفر خوش گوار گزرا۔ آثم خوش مزاج لڑکا تھا جو بوریت کو قریب پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔

سیہون پہنچ کر وہ آثم کی رہبری میں مسافر خانوں میں پھرتے رہے۔ بالآخر انھیں بڑی مشکل سے ایک مسافرخانے میں سنگل کمرہ مل سکا۔ کمرہ کیا تھا بس کسی طرح سے ایک چارپائی پھنسا کر، کسی طریقے سے اک کرسی بھی رکھ دی گئی تھی۔ وہ سامان کمرے میں رکھ کر میلہ دیکھنے چلے گئے۔

بہت زیادہ لوگ آئے ہوئے تھے۔ تنگ گلیوں میں لوگوں کی آمدورفت جا رہی تھی۔ آثم نے چلتے چلتے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے مزار کی جانب لے جانے لگا۔ آدم حیرانگی اور تعجب کے ساتھ ان لوگوں کو دیکھتا رہا۔ تماش بین، نشے باز، عقیدت مند، بھلائی کے طلب گار، گداگر، مست ملنگ، سکون بخشنے والے، مالش کرنے والے، بیوپاری— میلے کا اپنا ہی ماحول تھا اور ہر طبقے کے لوگ اس ماحول کا حصہ بن گئے تھے۔

راستے میں آتم کسی کسی آدمی کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کر دیتا تھا اور اپنی سی کوشش کرتا کہ ان کے ساتھ مس کر کے گزرے۔ حسین مکھڑے بہت نظر آ رہے تھے۔ بقول آتم کے اصل مزہ تو دھمال پر آئے گا۔

وہ درگاہ میں داخل ہو گئے۔

صحن میں کئی مرد اور عورتیں نقارے کی چوٹ پر مست جھوم رہی تھیں، آتم نے اس کا تعارف 'دھمال' کہہ کر کرایا تھا۔

وہ ناچنے والوں کو حیرت کے ساتھ دیکھنے لگا۔ جو رقص نہ جانتے ہوئے عجیب انداز میں ہاتھ اوپر اٹھا کر گول چکر کاٹ رہے تھے۔

وہ سب خود کو مست ثابت کرنے کے لیے ایکٹنگ کر رہے تھے۔ کم از کم آدم کا تو یہی خیال تھا۔ آتم نے اسے اک نوجوان عورت کی طرف متوجہ کیا جس کے تنگ لباس سے اس کے مضبوط جوان جسم کے نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ مجذوب ہو کر گردن پھیر کر مزار کے اندرونی حصے کو دیکھنے لگا۔

مزار کے اندر پہنچنا واقعی اک مشکل مرحلہ تھا۔ اک دروازہ تھا اور اندر جانے کے خواہش مند ہزاروں تھے۔ آتم اس کا ہاتھ کھینچتا ہوا، دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دروازے کے قریب جا پہنچا۔ آدم کو دروازے سے اندر داخل ہونا ناممکن لگ رہا تھا۔ آتم نے اسے تاکید کی کہ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ لے اور اس سے دور نہ ہونے پائے۔ خلقت سے زور آزمائی اور دھکم پیل کرتے ہوئے وہ بڑی مشکل سے دروازے کے اندر داخل ہوئے۔ بھیڑ لوگوں کی اکثریت کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ اجسام کی قربت کچھ اور ہی احساس دے رہی تھی، جو کچھ لوگوں کے واسطے لذت انگیز تھی اور باقیوں کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ آتم نے گردن کو تھوڑا سا جھکا کر آدم کے کان میں کھسر پھسر کرتے ہوئے اسے ایک نوجوان عورت دکھائی جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ مردوں کی 'قربت' کی وجہ سے پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

وہ دونوں زیارت کر کے دوسری طرف کے دروازے سے باہر نکل گئے۔ اس

طرف زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ شہر میں مختلف مقامات پر مجمعے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کوئی کنجری رقص کر رہی تھی تو کہیں کوئی ہیجڑا انتہائی بے حیائی کے ساتھ فن کا مذاق اُڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ لوگ بڑے اشتیاق کے ساتھ ان مناظر سے محظوظ ہو رہے تھے۔ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو بے چارے عقیدت کی ڈور میں بندھے وہاں پہنچے تھے جن کی آنکھوں میں احترام کے سائے، چہار اطراف موجود غلاظت پر نگاہ کرنے سے گریزاں تھے اور وہ اپنی نیازمندی میں غرق، اس مستی میں ڈوبے ماحول سے بے نیاز، تقدس کے ڈگ بھرتے جا رہے تھے۔ وہ جگہ جگہ ٹھہرتے، ہر شے کو دیکھتے ہوئے واپس مسافرخانے لوٹ آئے۔ آثم باہر موجود نلکے پر نہانے کے لیے چلا گیا۔ آدم کرسی پر بیٹھ کر پرانے رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آثم نہا کر واپس آ گیا۔ گیلی تہ بند اس کے سنہرے بدن سے چپکی ہوئی تھی، جس سے کہیں کہیں سے آثم کے جسم کی رنگت بھی جھلک رہی تھی۔ وہ اُچھل کر چارپائی پر چڑھا اور اپنے تھیلے سے دُھلی ہوئی شلوار نکال کر اس میں اِزار بند ڈالنے لگا۔

آدم کوشش کے باوجود خود کو روک نہ سکا۔ اس نے دو تین بار چور نگاہوں سے آثم کے خوب صورت بدن کو دیکھا۔ اس کے ذہن میں کوئی خیال آیا اور وہ فوراً آنکھیں جھکا کر توجہ سے رسالہ پڑھنے لگا۔

وہ دونوں تیار ہو کر باہر چلے گئے۔

میلہ گھومتے پھرتے سرکس کی طرف جا نکلے۔

اک مرد زنانہ کپڑے پہنے لکڑی کے اسٹیج پر بھارتی فلمی گانے پہ ناچ رہا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ اس مرد کے رقص پر کوئی بھی پیسے نچھاور نہیں کر رہا تھا۔ آدم نے دل میں سوچا، ''یہ تو خیرات لگ رہی ہے...'' ہر پانچ منٹ کے بعد سرکس کے کمالات کا اعلان ہوتا رہا اور مفت کا ناچ جاری رہا۔

کچھ دیر کے بعد وہ اندر بیٹھے سرکس دیکھ رہے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ہنسی نکل جاتی۔ مسخروں کے رنگین چہرے اور ان کی حرکتیں تھیں ہی ایسی۔

جھولوں پر بازی گروں کے کرتب واقعی متاثر کن تھے۔ لڑکیوں کی گھڑ سواری بھی

زبردست تھی مگر بیٹھے ہوئے افراد زیادہ تعریف ان لڑکیوں کے باریک لباس کی وجہ سے کر رہے تھے۔ نوجوان لڑکیوں کے متناسب جسم مختصر لباس میں بے باکی سے دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔

آدم نے اپنے لہو میں کوئی شے حرکت کرتی ہوئی محسوس کی۔ اس نے آثم کی طرف دیکھا جس نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کوئی ہنسی کی بات کی تو وہ دونوں قہقہے لگا کر ہنس پڑے۔ لڑکیوں کے جسموں کی نمائش پر تالیوں کا شور بڑھتا چلا گیا۔ آدم ابتدا میں تالیاں بجاتے ہوئے ذرا ہچکچایا تھا۔

سرکس سے واپسی پر انھوں نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ سرکس پر تبصرہ کھانا کھاتے ہوئے بھی جاری رہا۔

آثم بار بار کالی نیکر والی لڑکی کی تعریف کر رہا تھا۔ آدم بھی لڑکی کی تعریف سن سن کر اس کی خوب صورتی کا معترف ہوگیا۔

کھانا کھا کر انھوں نے مسافر خانے کا رُخ کیا۔

چوک پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ بھی خود کو روک نہ سکے اور آگے بڑھ کر ہجوم میں شامل ہوگئے۔

کسی 'دیسی شاعری' پر دو لڑکے 'ڈانس' کر رہے تھے۔ انھوں نے مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے مگر وہ بہت تنگ اور شوخ رنگوں کے تھے۔

'دیسی شاعری' کے مصرعوں میں بے باکانہ محبت کا اظہار تھا۔ دونوں رقاص پیار سے اک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے اور جمع ہو جانے والے لوگوں کی بدمستی عروج پہ تھی۔ شاعری میں معشوق کی آنکھوں، گالوں اور بدن کی تعریف عام لہجے میں زوردار انداز میں کی گئی تھی۔ لڑکے بھی اک دوجے کے ساتھ چپک چپک کر بے حجابانہ حرکتیں کر رہے تھے۔ لوگوں کی سیٹیوں اور ہاو ہو سے آدم کو شرمندگی ہو رہی تھی۔

اُدھر تماشائی حضرات نوٹ نچھاور کر رہے تھے۔

آثم نے گردن گھما کر ہلکے رنگ کی قمیص والے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کچھ کہا، آدم کے کان سرخ ہوگئے۔

اک 'دیسی کلام' ختم ہوا تو دوسرا شروع ہوگیا۔ اس بار تو اشعار کچھ زیادہ ہی 'بے باک' تھے۔ محبوب کے جسم کی طلب کا اظہار بے دھڑک کیا گیا تھا۔ اب تو رقاصوں کی مستی کچھ بڑھ گئی۔ آدم کو ان کے ٹھمکے اچھے لگ رہے تھے۔ اس کی کنپٹیاں بجنے لگیں۔

رقص و سرور اور لوگوں کی بدمستی کے باعث وہ جذبات میں آ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آثم کے بہت قریب ہوگیا تھا۔

وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹا تو سہی، مگر اس کے پیچھے بھی لوگ کھڑے تھے۔ وہ پھر سرک کر آگے ہوگیا۔

نوٹ نچھاور کرنے والے تین اشخاص میں مقابلہ شروع ہوگیا۔ رقاص بھی نوٹ لیتے وقت اُن کا خاص خیال رکھتے ہوئے ان کے قریب جا کر زور زور سے ٹھمکے لگاتے۔ تب نوٹ نچھاور کرنے والوں کی آنکھوں میں جھلکتے فخر اور تکبر کے شرارے، دیکھنے والوں کو جلا رہے تھے۔

آدم کے پیروں کے تلوے جلنے لگے تھے۔ اس نے آثم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلنے کا اشارہ کیا۔

دونوں واپس مسافر خانے کی طرف چل پڑے۔

''نوٹ نچھاور کرنے والا شخص ہلکی رنگت کی قمیص والے ڈانسر لڑکے کو اپنے ساتھ لے جانے کی خاطر اتنی سخاوت دکھا رہا تھا۔'' آثم نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''عیاشی کرنے کے لیے؟'' آثم نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

کمرے میں پہنچ کر آثم لباس تبدیل کرنے لگا۔

اس بار آدم اپنی نظروں کو روک نہ سکا تھا۔

پورا دن آدم جو کچھ دیکھتا رہا تھا، اس نے آدم کی جبلی خواہشیں مکمل طور پر بیدار کر ڈالی تھیں اور وہ مزید بے باک ہو رہا تھا۔

آشم نے اس کی بے باکی کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

سیمون کا میلہ اس کے لیے انتہائی دل چسپ تجربہ تھا۔ وہ اس میلے کے مشاہدات کسی سے ذکر کرنے کے لیے بے چین تھا۔

شکر ہے کہ اسے یہ موقع نصیب ہو ہی گیا۔ 'حوا' کا خط ان ہی دنوں آیا ہوا تھا۔ اس نے میلے کا احوال دل چسپ انداز میں لکھ کر حوا کو بھیجا تھا۔

حوا کو خط لکھنے کا سلسلہ ایک سال قبل ان کی منگنی ہونے کے بعد شروع ہوا تھا۔ اگرچہ اس دوران اس کے چچا نے اک دو بار دبے لفظوں میں اعتراض بھی کیا تھا۔ مگر وہ خود کو روک نہیں سکا تھا۔ خطوط اس کی واحد دل چسپی تھے اور وہ انھیں بند کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ان کی شادی آئندہ برس متوقع تھی۔ وہ شدت کے ساتھ اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔

اس نے خط میں سیمون کے دل چسپ حالات کو مزاحیہ رنگ میں مزے سے لکھا تھا۔ البتہ اس نے خود کو آشم کا ذکر کرنے سے بڑی مشکل سے روکا تھا۔

چند دن تک وہ خوش گوار تصورات ہمہ وقت اس کے ساتھ رہے۔ اچانک خوب صورت خیالات کا یہ مندر ریزہ ریزہ ہوکر زمیں بوس ہوگیا۔ اس کے ذہن میں جو طوفان آیا تھا اس سے خیالات اور تصورات کے پرانے تناور درختوں کی جڑیں اُکھڑ گئی تھیں۔

اسے پیشاب میں پیپ آنے لگی تھی۔

وہ اپنے نزدیک خود بھی مشکوک ہو چکا تھا۔ اس پیپ کی موجودگی کوئی پیچیدہ بیماری جنم دینے کا اعلان بھی ہوسکتی تھی۔

وہ یہ دعا کرتا رہا کہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ خود بخود ختم ہوجائے۔ کسی سے اپنی اس بیماری کی تفصیل کہنا آدم کے لیے انتہائی تکلیف دہ تصور تھا۔

پیپ آنے کے ساتھ ساتھ اب آدم کو بخار بھی رہنے لگا تھا۔

اس نے آفس جانا بند کیا تو آفس کے ساتھی مزاج پرسی کرنے کوارٹر پر آگئے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔

اگلے روز وہ سول اسپتال گیا۔

''کس ڈاکٹر کو دکھایا جائے؟ ڈاکٹر کو کیا بتایا جائے؟''

آخر ہمت کر کے اس نے پرچی بنوائی۔ خدا خدا کر کے ڈاکٹر تک پہنچا مگر وہاں تو بہت زیادہ لوگ موجود تھے۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ کہہ نہ سکا، بس بخار کی دوا لے کر لوٹ آیا۔

ہر لمحہ ہزار دعائیں کرنے کے باوجود اس کی صحت ٹھیک نہ ہوئی۔

''کسی ڈاکٹر کو رپورٹس دکھائی جائیں۔'' اس کے ذہن نے راہ دکھائی۔ مگر اس کا ڈاکٹروں سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس لیے اسے کوئی بھی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے بعض لوگوں سے کسی ڈاکٹر کا دریافت بھی کیا۔

''کئی اسپیشلسٹ ہیں، ہر کوئی اپنے اپنے شعبے میں ماہر ہے۔ آپ کس بیماری کے لیے پوچھ رہے ہیں؟''

جواب تو الٹا سوال ہی تھا— وہ کیا بتائے! کیسے بتائے!!''

لیکن اگر بتائے گا نہیں تو علاج کیسے ہوگا؟ ''وہ پھوڑے پھنسیوں کے لیے۔'' اس نے پوچھا۔

''اسکن والا انصاری قابل ہے۔'' اسے جواب ملا تھا۔

اک دن وہ دل کڑا کر کے تڑپتا کراہتا جلدی امراض کے ڈاکٹر کے پاس چلا ہی گیا۔ ڈاکٹر نے تنہائی میں اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے اٹکتے اٹکتے بتایا، ''پیشاب کی تکلیف ہے... اور... اور... پیپ بھی آتی ہے۔''

ڈاکٹر نے شلوار اتارنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھبرا گیا۔ عریانی کے تصور نے اس کے دل کو جکڑ لیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گردن جھکا کر فرش کو دیکھنے لگا۔

''جلدی کرو۔'' ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔

توہین کے احساس کا دکھ شدید تھا۔

اس نے مرض، علاج اور مسیحا کی مثلث کا تصور کرتے ہوئے اس احساس کو کم

کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر نے ہاتھ پر دستانہ چڑھاتے ہوئے آدم کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا، ''کسی فاحشہ عورت کے پاس گئے تھے؟''

اس نے بلا سوچے نفی میں گردن ہلا کر انکار کیا۔

''پھر؟'' ڈاکٹر نے سوال پر زور دیا۔

اس نے گردن اوپر اٹھائی، بس زمین پر نگاہیں جما کر دیکھتا رہا۔

ڈاکٹر نے ہاتھ سے شلوار پہننے کا اشارہ کیا۔

''یہ گھٹیا حرکتیں تمھیں قبر میں پہنچا دیں گی— اس گندگی میں گرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اپنی ذلالت سے بازو کیوں نہیں آتے— اب کون سا منہ لے کر کھڑے ہو؟ ڈاکٹر نے دستانہ اتار کر سینک میں ہاتھ دھو کر کاغذ پر کچھ لکھ کر اسے دیا۔

''یہ ٹیسٹ کروا کر آؤ۔''

اس نے کانپتے ہاتھوں سے ڈاکٹر کو فیس دی اور باہر سڑک پر نکل آیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر کی تیکھی، جانچتی نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اس نے لیبارٹری کا رُخ کیا۔ وہ جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ وہ پہلے ہی بہت وقت ضائع کر چکا ہے۔

اسے امید تھی کہ وہ لیبارٹری سے رپورٹ لے کر اسی روز ڈاکٹر کو دکھا سکے گا۔

لیبارٹری میں کافی رش تھا۔

اس نے کاغذ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کو دیا۔

کاغذ ہاتھ میں لے کر، پڑھنے کے بعد اس شخص نے آدم سے کہا:

''کل بارہ بجے تک آیئے گا اور خیال رہے کہ صبح سات بجے کے بعد پیشاب ہرگز نہ کریں۔''

''کیا ابھی ٹیسٹ نہیں ہوگا؟'' اس نے فوراً پوچھا۔ وہ زیادہ پریشان ہوگیا تھا۔

''مجھے تو آج ہی ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔''

"جناب! اس ٹیسٹ کا رزلٹ چار دن کے بعد ملے گا۔ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔"

"کاہے کا ٹیسٹ ہے؟" اس شخص کے ساتھ کھڑا آدمی پوچھ رہا تھا۔

اس نے ٹیسٹ کا نام لیا تو اس شخص نے آدم کو تعجب کے ساتھ دیکھتے ہوئے پوچھا، "کیا یہ ٹیسٹ آپ کا ہوگا؟"

سارے بدن کا لہو دماغ کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے۔ سامنے کا منظر دھندلا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ سرِ عام چوک میں ننگا کھڑا ہو اور لوگوں کا ہجوم اسے دیکھ رہا ہو۔ سب کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ اس نے صرف یہ محسوس کیا کہ اسے وہاں کھڑے کھڑے جگ بیت چکا ہو۔ وہ بے عزتی کا اک جنم گزار چکا ہو۔ گناہ آلود صدی کے سائے اس کے ذمے قرار دے دیے گئے ہوں۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ کاؤنٹر پر موجود شخص کے ہاتھ سے کاغذ جھپٹ کر وہ تیزی کے ساتھ لیبارٹری سے نکل گیا۔ وہ رونا چاہتا تھا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کوارٹر پر پہنچا اور خود کو چارپائی پہ پھینک دیا— مگر وہ رو نہ سکا۔ بے عزتی کے احساس نے دکھ اور غصے کے احساس کو یوں توڑ مروڑ دیا تھا کہ وہ دکھ کو غصے سے جدا کر کے اپنے اندر کی آگ کو آنکھوں کے پانی سے بھی بجھا نہ سکا۔ یوں لگا جیسے آنکھوں کا پانی خشک ہو چکا ہو۔

چند دن اور بھی گزر گئے۔ تکلیف بھی کچھ کم محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اک موہوم امید ہوگئی کہ وہ خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے کبھی بھی اس آس کا سبب سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ بس اس امید کو ہی جینے کا ذریعہ سمجھ رہا تھا۔

رمضان المبارک کا مہینا آیا تو آفس کے ساتھیوں نے وقت گزارنے کے لیے بیڈمنٹن کھیلنا شروع کر دی۔ آدم بھی جوش کے ساتھ کھیل میں شریک ہو گیا۔

رات کو اسے شدید بخار نے آ لیا۔ اس کی نیند اُڑ گئی، منہ خشک ہو گیا۔ وہ پانی پینے کے لیے چارپائی سے اُٹھا تو وہ کراہ اٹھا۔ درد کی لہر اتنی شدید تھی کہ فرش پہ گر گیا۔

صبح وہ آفس نہ جا سکا۔ آفس کے ساتھ آئے۔ انھوں نے ڈاکٹر کے پاس چلنے کو

کہا۔ ڈاکٹر کا سن کر اس پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ اسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

وہ ڈسپرین کی گولیاں کھا کر سو گیا۔ درد کم ہوا نہ ہی بخار اترا۔ سہیل نے سیپڑان کی گولیاں دیں۔ اس کا بخار اتر گیا اور درد بھی کم ہوگیا مگر اس نے کھیلنا چھوڑ دیا۔

اسے ہفتے دو ہفتے بعد بخار آنے لگا۔ وہ سیپڑان کی گولیاں کھاتا رہا۔ اس کی طبیعت میں فرق آ گیا تھا۔ اس نے یار دوستوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ترک کر دیا، گاؤں جانا بھی کم کر دیا تھا۔

تکلیف کے شدید احساس کے باعث وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کا سوچتا تھا لیکن پھر یہ بات اگلے دن پہ ٹال دیتا۔

ایک دن اسے تلک چاڑی پہ کتابوں کے ٹھیلے پر کتابچہ ''جنسی بیماریاں— مؤلفہ مولوی ہدایت اللہ'' نظر آیا۔ اس نے کتابچہ خریدا اور اخبار میں چھپا کر اپنے کوارٹر پر لے آیا۔ دروازہ بند کر کے کتابچہ پڑھنا شروع کیا۔ کتابچے میں کسی مرض کی علامتیں درج تھیں، نہ ہی کسی بیماری کا علاج۔ البتہ قرآنی آیات، بزرگانِ دین کے اقوالِ زریں اور جنسی بیماریوں کی تباہ کن اثرات کے متعلق تذکرہ تھا۔ مولوی صاحب کے بقول... ''یہ بیماریاں بھی عذابِ الٰہی ہیں اور گناہ گاروں کے لیے اس دنیا میں عذابِ جہنم کا ہلکا سا نمونہ ہے۔ ایسے امراض گناہوں کی سزا ہیں اور اللہ کی سزا سے بچنا ممکن نہیں ہے... نہ صرف گناہ گاروں کے لیے سزا ہے بلکہ یہ ایسی سزا ہے جو ان کی نسلوں کو بھی بھگتنی پڑتی ہے۔ یہ سزائیں نطفے کے ذریعے اولاد کے خون میں شامل ہو جاتی ہیں...''

آدم کتابچہ اک طرف رکھ کر انتہائی پریشانی کے عالم میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ ان باتوں نے تو اس کے دل کو الجھا دیا تھا۔ وہ اس قدر خطرناک بیماری میں مبتلا ہو چکا تھا جسے ساری زندگی جھیلنا تھا اور یہ مرض تو نہ صرف اک زندگی بلکہ نسل در نسل چلنے والا تھا...

اس کے تصورات میں حوا کی تصویر چلی آئی...

حوا کے کئی خطوط آئے مگر اس نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی تشویش بڑھتی گئی۔ ذہن کے پردوں پر پریشانی کے ہلکے اور گہرے رنگ چکا چوند کرتے تیرتے

رہے۔ ہر دم موجود رہنے والی حوا کی تصویر اب دھندلانے لگی تھی۔

اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آنسو تکیے میں جذب ہوتے رہے اور وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ اپنی بے بسی کے شدید احساس نے اس کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ جانے کب اسے نیند آ گئی۔

صبح اس کی طبیعت بہتر تھی۔ وہ آفس میں ذرا چست دِکھ رہا تھا۔ اس نے خط لکھا مگر حوا کے لیے نہیں، چچا کے لیے۔ اس نے اپنی طرف سے منگنی توڑنے کا فیصلہ لکھ دیا۔

چند دن کے بعد اس کی حالت خراب ہوگئی اور بگڑتی ہی چلی گئی۔ وہ سیپٹران کی مقدار بڑھاتا رہا۔ سہیل اسے اک واقف ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ وہ سارا راستہ ایسے موزوں الفاظ سوچتا رہا جن کے ذریعے ڈاکٹر سے اپنی بیماری کا احوال کہہ سکے۔ اس نے ٹھان لیا کہ ڈاکٹر کو سب کچھ بتا دے گا۔ مگر ڈاکٹر کے روبرو پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے صرف پیشاب کی تکلیف اور پسلیوں کے نیچے درد کی شکایت کی۔ ڈاکٹر نے سہیل کو مشورہ دیا کہ کسی کڈنی اسپیشلسٹ کو دکھایا جائے۔ اس کے خیال کے مطابق گردوں میں انفیکشن تھا۔

آدم کے ذہن میں خیالات کی جنگ جاری تھی۔ اس نے سوچا کہ ڈاکٹر کو اپنا راز بتا دے مگر وہ جھجک کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے ذہن میں اک لمحے کے لیے آتم کی صورت اُبھر آئی۔

وہ اسپیشلسٹ کے پاس نہ گیا۔

سہیل نے اسے ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہا مگر وہ ٹالتا رہا۔ اسی طرح چار سال کا عرصہ گزر گیا۔ اب اکثر اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ جسمانی تکلیف سے کہیں زیادہ ذہنی اذیت تھی جو اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اسی عذاب سے دوچار رہا۔

منگنی توڑ دینے کے بعد آدم کا اپنے گاؤں سے تعلق ختم ہوگیا تھا۔ بس کبھی کبھار حوا کا غم ناک چہرہ اسے خواب میں بھی پریشان کردیتا تھا اور وہ دل میں ہزار بہانے اور وجوہات سوچ کر اس پریشانی کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس کی حالت خراب ہوئے آج دوسرا دن تھا۔ اس نے کسی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ کر بھی نہیں سکتا تھا، کیوں کہ عید کی تعطیلات کے باعث ہر کوئی اپنے اپنے گھر جا چکا تھا۔ وہ خود کوارٹر سے نکلنے سے لاچار تھا۔ بس چارپائی کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ وقفے وقفے سے اسے ہوش آتا مگر کم زوری کی وجہ سے آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ گزشتہ کئی روز سے پیشاب کی مقدار بہت کم رہ گئی تھی۔ مگر دو دن سے تو وہ بھی بند ہو چکا تھا۔

ذہن پر غنودگی طاری تھی لیکن درد کی شدت سے وہ بے ہوشی کے عالم میں بھی تڑپ کر جاگ اٹھتا تھا۔ کتنی بار اس کا جی چاہا کہ وہ چیختا چلاتا ہوا باہر نکل جائے اور ساری دنیا کو بتائے کہ اس نے گناہ کیا تھا جس کی تکلیف اور بیماری جھیل رہا تھا جس کی اسے کافی سزا مل چکی۔ اب تو اس کا علاج کرایا جائے... اب تو اسے زندگی لوٹا دی جائے۔

مگر وہ ایسا کر نہ سکا— جانے کیوں؟

وہ درد کے مارے خوابیدہ ذہن میں جانے کیوں اپنے مرنے کی دعائیں کرنے لگا۔ اس دعا کے تصور سے اسے خوشی ملی، اسے اتنے برسوں میں پہلی بار خوشی ملی تھی۔ اک رنجیدہ خوشی۔

اس کا ذہن اک مرتبہ پھر غنودگی کی دنیا میں چلا گیا۔ جب وہ ذرا سنبھلا تو چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب ذہن میں بس روشنی کی اک ہلکی سی لکیر تھی۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ بدن میں بالکل جان نہیں تھی۔ اسے کوئی سدھ نہیں تھی۔ اگر کوئی احساس باقی تھا تو وہ درد کا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ پسلیوں کے نیچے کسی شے کا حجم بڑھتا جا رہا تھا— بڑھتا جا رہا تھا— اسے اپنا جسم چارپائی کی حدود سے باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ اسے شک گزرا کہ جیسے اس کی پسلیاں اک دھماکے کے ساتھ پھٹ جائیں گی اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر جائے گا۔

اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا تھا۔ سانس جسم کے ہر حصے سے نکل کر آنکھوں کی پتلیوں میں آ بیٹھا تھا۔ افسردگی اور موت کی زرد روشنی میں ذہن نے آخری بار سوچا، مر جانے سے گناہ کی سزا ختم ہو جائے گی اور گناہ کی داستان بھی۔''

زرد روشنی کی باریک لکیر بڑھتی گئی۔ بڑھتی گئی اور ذہن میں یک دم نور کا سیلاب آ گیا۔ کتنے ہی مناظر اور چہرے ظاہر ہوکر اک دوسرے میں مدغم ہوگئے، مگر اک مسکراتا ہوا چہرہ اس نے پہچان لیا۔ وہ چہرہ دوسروں سے منفرد تھا۔

آدم کے ہونٹوں پہ سکون آمیز مسکراہٹ تھم گئی، جس کے لیے وہ جیتے جی ترستا رہا تھا۔

جہنم

لاؤڈ اسپیکروں پر حمد، نعت اور درود و سلام کا زور شور تھا۔ ہر طرف عجیب سا شورغل برپا تھا۔ میرے محلے کی ساری مسجدوں کے مولوی حضرات اپنے ہنر کی داد کی طلب میں اپنے اپنے بے سُرے گلے پر بے جا زور صرف کر کے، تان سین کو مسلمان کرنے کی کوشش میں مصروف معلوم ہوتے تھے۔

میرا اندازہ تھا کہ محلے میں غالباً چار یا پانچ مسجدیں ہوں گی، لیکن ایک دفعہ جب میں پتا کرنے نکلا اور گنتے گنتے گیارہویں مسجد تک پہنچ کر، گنتی ادھوری چھوڑ کر گھر پہنچا اور چپ سادھ کر بیٹھ رہا۔

آج ان تمام مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکر اپنی اسلام پسندی کا بھاری بھرکم ثبوت باآوازِ بلند پیش کررہے تھے۔ جس وجہ سے میں اپنے بیمار اور تھکے جسم کو سلا نہ سکا۔ یہ سلسلہ تادیر جاری رہا، آخرکار شور ختم ہوا اور مجھے فوراً پرسکون اور گہری نیند آ گئی۔

میں جانے کتنی دیر میٹھی نیند کے جھولے میں جھولتا رہا تھا کہ اچانک سینے پر بوجھ محسوس کیا۔ بوجھ دھیرے دھیرے تکلیف کی حد تک بڑھ گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک عجیب بدصورت جانور سینے پر سوار ہے۔

کون سا جانور ہوسکتا ہے؟ یہاں شہر تک کیسے پہنچا؟

ذہن مصیبت میں ہونے کی وجہ سے تیزی سے کام کرنے لگا۔ فوراً کئی تصویریں

ذہن کے پردے پر ابھریں اور معدوم ہوگئیں۔ ذہن دوڑتا رہا، ''کون سا جانور ہے؟ کون سا؟''

اس کے ہاتھ میں ایک نوک دار نیزہ بھی تھا، جسے وہ میرا سانس نکالنے کے لیے استعمال کررہا تھا۔

''ملک الموت!'' ذہن نے اسے سمجھایا۔

تکلیف کا احساس ختم ہوگیا۔ سوچا کہ موت بھی ایک سفر ہے، ایک تبدیلی ہے اور تبدیلی ہمیشہ بہتر ہوتی ہے۔ اس خیال کی بدولت پورے وجود پر فرحت کا احساس چھا گیا۔ وجود کا سفر شروع ہوا۔

اپنے انجام کا یقین نہیں تھا، گناہوں ثوابوں کے حساب کتاب کا بھی پتا نہیں تھا، کبھی سنتا تھا کہ گناہوں کا حساب یوں رکھا جاتا ہے جیسے بینک میں بلاسود اکاؤنٹ۔ نیکیاں اور گناہ جمع ہوتے رہتے ہیں، اگر گناہ مجموعی نیکیوں سے بڑھ گئے تو پھر دوزخ میں جانا پڑے گا۔ کبھی یوں بھی کہتے تھے کہ بے شک نیکیاں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں بعض گناہوں کی سزا تو ضرور ملے گی۔ چند ایک سے سنا تھا کہ ہر کلمہ گو پر دوزخ کی آگ حرام ہے، خواہ وہ عادتاً ہی کلمہ پڑھتا ہو۔

زندگی میں آڈٹ اور اکاؤنٹ کے شعبے میں رہا تھا اور پنشن ابھی مل نہیں سکی تھی لہٰذا پریشان تھا، یقین تھا کہ حساب کتاب میں مارکھا جاؤں گا، وگرنہ مجھے دوزخ کا خوف اور جنت کا شوق زندگی میں کبھی بھی نہیں رہا تھا۔

وجود ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ اوپر کو اڑتے چلے جارہے تھے، سفر طویل تھا اور ہمراہی بھی پختہ کار دکھائی دیتا تھا۔ بلندی پر پہنچ کر اس نے مجھے سفید لبادہ پوش کے سپرد کیا جو مجھے اپنے ہمراہ لے کر ایک بڑی عمارت میں داخل ہوگیا، جس میں بے شمار کمرے تھے۔ ہم نے چھوٹے اور تنگ کمروں سے گزرنا شروع کیا، جہاں ریشمی گدوں پر لیٹے ہوئے اُجلے چہروں والے لوگ انتہائی اخلاق سوز حرکات میں مصروف دکھائی دیے۔ لیکن ان کے چہروں پر کسی بھی قسم کا خوف یا پشیمانی نہ تھی۔ اس کے بجائے بڑی سنجیدگی اور انتہائے شوق واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ شاید وہ لوگ پوری زندگی ان مشاغل کے منتظر رہے تھے۔ مجھے کراہت

محسوس ہوئی اور تاؤ آن لگا سو گردن جھکائے چلتا رہا۔

آخرکار موصوف مجھے ایک بڑے ہال میں لے آئے۔ وہاں پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ سفید چوغوں والے مستعدی سے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو ذرا معتبر دکھائی دیتا تھا، طویل کاغذ تھامے میرے سر پر آن کھڑا ہوا۔ میری طرف بے رحمانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا:

''چلو! تمھارا فیصلہ ہوگیا ہے۔''

''کیا مجھے پیش نہیں کریں گے؟'' میں نے مایوس ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اتنی فرصت نہیں ہے کہ ہر کسی کو پیش کیا جائے۔'' وہ نفرت کے ساتھ گردن ہلاتا ہوا بولا۔

''لیکن میں نے تو سنا تھا کہ ہر کسی کو پیش ہونا پڑے گا اور ہر کوئی اپنے اعمال کا جواب دہ ہوگا۔ مجھے اپنی صفائی پیش نہیں کرنی، لیکن مجھے بات کرنے کا موقع تو ضرور ملنا چاہیے۔''

اس نے غصّے اور نفرت بھری تیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے دانت کچکچائے، ''خود کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو دوزخی! تم بحث کر کے جان چھڑانا چاہتے ہو— ہرگز نہیں۔ ہم تمھیں زبان چلانے نہیں دیں گے، چلو اب!''

میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے مجھے ایسا دھکا دیا کہ میں زمین پر گرتے گرتے بچا۔ گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھا کر دھکیلتے ہوئے ہال سے باہر لے گیا۔

مجھے یقین ہوگیا کہ اس جہاں سے میری بے دخلی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ پھر یہاں واپسی نہ ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی میں اس سنسار کو غور سے دیکھنے لگا، کیوں کہ مشاہدہ بھی حصولِ علم کا ایک ذریعہ ہے۔

سامنے ایک شاہی راہ گزر تھی، جو کہ سیدھی نہیں تھی بلکہ اس سے کئی آڑی ترچھی، خم دار گلیاں نکلتی تھیں۔ ہر گلی کے آغاز پر پھلوں کے دو چار درخت لگے تھے جن میں رِستے ہوئے پھل لگے تھے۔ درختوں کے تنوں میں ٹونٹیاں موجود تھیں جن سے کچھ لوگ پھلوں کا رس پی رہے تھے۔ یہ منظر بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی بس اسٹاپ پر اللہ کے کسی نیک

بندے کی طرف سے تعمیر کردہ سبیل کی ٹونٹی سے مسافر ہاتھوں کا پیالہ بنا کر پانی پیتے ہیں۔

عجیب بات یہ تھی کہ ان درختوں میں آم کا ایک بھی درخت نہیں تھا۔ دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ظاہر ہے جو چیز یہاں نہیں ہے وہ وہاں ہوگی۔ دماغ نے منطقی انداز میں نتیجہ اخذ کیا۔ اس خیال نے طبیعت پر خوش گوار اثر ڈالا۔

راستے میں سفید چولوں والے کثرت سے پھر رہے تھے۔ یہ انسان نہیں تھے۔ ان میں اور انسانوں کے مابین فرق تھا، ان کے چہروں پر ڈاڑھیاں نہیں تھیں۔ ان کی شکلیں دیکھ کر عمر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا، شاید جواں تھے۔ ہزاروں لاکھوں برسوں سے اسی طرح کے تھے۔ ہزاروں لاکھوں برسوں کے معلوم ہوتے تھے۔ وہ چپ سادھے اپنی راہ چل رہے تھے، وہ سہمے ہوئے تھے اور گردن کو اِدھر اُدھر نہیں گھما رہے تھے۔ چور نگاہ سے میری طرف دیکھ کر کانپ رہے تھے۔

غالباً میرے متعلق ہونے والے فیصلے کی خبر پھیل چکی تھی اور وہ مختلف بہانوں سے مجھ جیسے کٹھور کافر کو دیکھنے کے لیے آ رہے تھے۔ وہ اپنے کام کاج میں مصروف دکھائی دینے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے، لیکن ان کی ایکٹنگ بالکل تھرڈ کلاس تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

میری مسکراہٹ دیکھ کر تو وہ لرز اٹھے۔ ان کے ادھ کھلے منہ، پھٹی پھٹی آنکھیں عجب نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ میں نے اپنی اس قدر اہمیت دیکھ کر فخر محسوس کیا اور ان کی اس حالت پر میرے منہ سے بے ساختہ ایک طویل، گونج دار اور بھرپور قہقہہ نکل گیا۔

ایک سفید چولا پوش، جو میرے پہلو سے گزر رہا تھا، اس کی چیخ نکل گئی، بے چارہ گھٹنوں کے بل زمین پر جا گرا۔ دو تین تو راستہ چھوڑ کر قریبی گلی میں بھاگ پڑے۔ دوسرے حیرت زدہ ہو کر ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتے رہے۔

میرے ہمراہ جو سفید چولے والا تھا، اس پر باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے دھکے دیتا ہوا آگے کو گھسیٹتا رہا۔ شاید اس کا میری طرح کے خطاکاروں سے اکثر واسطہ رہتا تھا۔

مجھے دوزخ میں جانے کا کوئی خوف نہیں تھا لیکن اس کے جابرانہ رویے سے

الجھن ہونے لگی۔ میں نے اس سے اپنا بازو چھڑا کر زور سے دھکا دیا۔ وہ بھی ہٹنے والا کب تھا۔ دانت کچکچا کر 'ملعون' کا نعرہ لگا کر اس نے مجھے قوت سے دھکا دیا۔ یوں ہم چلتے رہے۔ سامنے ایک عجیب نظارہ ہمارا منتظر تھا۔ سفید چولوں والے جمع تھے، ان کی سرگرمی سے اندازہ ہوا کہ کوئی بڑی ایمرجنسی ہوگئی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو باآوازِ بلند بلا کر، ہدایات دے رہے تھے۔ ایک ریڑھا راستے کے ساتھ کھڑا تھا جس پر موٹے رسّے کے رول لپٹے پڑے تھے۔

نہر بہہ رہی تھی، جس پر لکڑی کا پل بنا ہوا تھا۔ چند سفید چولوں والے اس پل پر کھڑے تھے اور پل سے نیچے رسّے پھینک رہے تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی شخص نہر میں گر چکا تھا۔ جس کو بچانے کی خاطر کوشش ہو رہی تھی۔ نہر کے کنارے ایک لکڑی کے بنے رہٹ سے ملتی جلتی چرخی تھی جسے ایک سفید گھوڑا چلا رہا تھا۔ ہم نزدیک پہنچے تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ ایک سفید چہرے والے بزرگ نہر میں غوطے کھا رہے تھے۔ اگرچہ رسّے اس کے قریب تھے لیکن وہ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود ان تک پہنچ نہیں پا رہے تھے۔ نہر میں پانی کے بجائے نسواری رنگ کا کوئی انتہائی گاڑھا مائع تھا۔ اس کا بہاؤ بھی بہت آہستہ تھا۔ پل کے نیچے بنے ہوئے ندی کے دروازے بند کیے جا رہے تھے تاکہ ندی کے بہاؤ کو روکا جا سکے۔ وہ شخص شدید تکلیف میں مبتلا تھا۔ میں اس کی تکلیف دیکھ کر چپ نہ رہ سکا اور سفید چولے والوں کو ٹوکا، ''بے وقوفو! رسّے کے ساتھ کوئی چیز باندھ کر پھینکو تاکہ رسّا اس تک پہنچ سکے۔'' یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ ریڑھے سے رسّا اتار کر اس کے ساتھ لکڑی کا ایک بڑا ٹکڑا باندھ کر نیچے پھینکا گیا لکڑی کا یہ ٹکڑا اس شخص کے قریب جا کر گرا۔ رسّے کو اس قدر قریب دیکھ کر اس نے اپنی ہمت جمع کی۔ اس نے قوت صرف کر کے اپنے ہاتھ بہتے سیال سے باہر نکالے۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔

''یہ بہتا ہوا سیال کیا ہو سکتا ہے؟— کیا یہ؟...'' میں زیرِ لب بڑبڑایا۔ رسّا کھینچتے ہوئے سفید چولے والے نے جواب دیا، ''شہد ہے!''

ڈوبتے ہوئے شخص کو کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ اب وہ خطرے سے باہر تھا۔ بس کچھ

خوف زدہ تھا۔ اس کے پورے جسم سے شہد ٹپک رہا تھا۔ اس کی نورانی ڈاڑھی کے بال گردن کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں بے ساختہ ہنسنے لگا۔

میری ہنسی پر، میرے ہمراہ آنے والے سفید چوغہ پوش کو اپنا فرض یاد آ گیا۔ اس نے مجھے دھکا دے کر آگے چلنے کو کہا۔ پل والا راستہ بھی کھل چکا تھا۔ ہم پل پر پہنچے تو میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں نہر میں کودنے لگا ہوں۔ سفید چولے والے نے جست لگا کر مجھے بازو سے تھام لیا اور چلایا، ''چھلانگ مت لگانا پلید! خبردار اگر ندی کو خراب کیا۔ یہ شہد کی ندی نیک، پرہیزگار بندوں کے لیے ہے۔ یہ تجھ جیسے کافر کے لیے نہیں ہے!'' اس کی پریشانی دیکھ کر میں نے بلند آواز سے قہقہہ لگایا۔ اسے شدید غصہ آیا تو اس نے میری گردن پر زوردار مکا دے مارا۔ یوں وہ مجھے مارتا پیٹتا ایک بہت پرانی اور چوڑی دیوار کے نیچے لے آیا۔

دیوار کے قریب پہنچتے ہی اس ظالم کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اس نے ایک بڑے سوراخ سے لعنت کا اشارہ کر کے مجھے اندر دھکیلا اور خود باہر کھڑا رہا۔ اندرونی منظر میرے تصوّر اور گمان سے بالکل مختلف تھا۔ نہ آگ کا جلا دینے والا شعلہ تھا اور نہ ہی ببول کے کانٹے، نہ سانپ...

سامنے ایک بڑی چیک پوسٹ دکھائی دی، جو مکمل طور پر شیشے کی تھی۔ اس میں مختلف آلات اور کنٹرول سسٹم لگے ہوئے تھے۔ ایک معزز شخص جس کی چھوٹی فرنچ کٹ ڈاڑھی تھی، وہ ہلکے پھلکے اسپورٹس سوٹ میں ہاتھ لہراتا ہوا مسکراتا چلا آ رہا تھا۔

''ویلکم! ایٹ لاسٹ یور آر ہیئر۔'' اس نے بڑی محبت اور اپنائیت کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ہم کافی دیر سے آپ کے منتظر تھے۔ آپ کو تاخیر ہوگئی؟'' اس نے انگریزی میں پوچھا۔

''ان صاحب کی مہربانیاں تھیں!'' میں نے ہاتھ سے دیوار کے سوراخ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اسی وقت سفید چولے والے نے سوراخ سے اندر جھانکتے ہوئے

ہاتھ پھیلایا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر خوف کے تأثرات دیکھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے جلدی تھی اور فوری طور پر یہاں سے لوٹ جانا چاہتا تھا۔ معزز شخص نے پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا ڈبا، جس پر چند بٹن لگے ہوئے تھے۔ اس کے حوالے کیا۔ سفید چولے والا منہ کو ٹیڑھا کرتے ہوئے سوراخ سے غائب ہوگیا۔

''میرا نام چیخوف ہے!'' اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا، ''ہمیں آپ کی آمد کی خبر مل گئی تھی، لہٰذا میں خود آپ کا استقبال کرنے آیا ہوں۔''

اس نے اپنائیت کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے چیک پوسٹ میں داخل ہوگئے۔ جہاں ایک آپریٹر بیٹھا تھا اور مختلف اسکرینوں پر ہونے والی تبدیلیاں نوٹ کررہا تھا۔ ہمیں اندر آتے دیکھ کر اس نے شناسانہ انداز میں ہاتھ لہرایا۔ میں نے بھی ہاتھ ہلاکر اسے جواب دیا۔ اس نے بھی اسپورٹس سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بہت خوب صورت اور اسمارٹ تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں ننگا ہوں۔ چیخوف نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''آپ غسلِ صحت کرلیں تاکہ دیوار سے اس طرف کے اثرات ختم ہوجائیں۔''

غسل خانے میں بخارات بھرے ہوئے تھے۔ جسم کے مساموں سے برسوں کی تھکن آہستہ آہستہ خارج ہورہی تھی۔ اچھا خاصا وقت گزرنے کے بعد گرم بخارات ٹھنڈے ہونے لگے۔ بدن ہلکا ہونے لگا۔ میں خود کو ہشاش بشاش محسوس کرنے لگا۔ بخارات ختم ہوگئے۔ کمرہ صاف ہوگیا۔ بائیں سمت ایک دروازہ تھا جس پر ''انٹر پلیز'' کا نشان فلیش کررہا تھا۔ میں اندر داخل ہوگیا، یہ ڈریسنگ روم تھا۔

وارڈ روب کپڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ اتنے سارے مختلف فیشن کے کپڑے دیکھ کر حیران اور خوش ہوا۔ سوچ میں پڑ گیا کہ کون سے کپڑے پہنوں، فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔

نئے ڈیزائن جیسا کی کے کوٹ اور پلانٹیشن، جن میں سے ہر ایک نیویارک میں گزشتہ سال پندرہ ہزار ڈالر کا مل رہا تھا۔ جیورجو آرمینی کا ڈبل بریسٹ، جیمس ڈین کی بڑی کلاسیکل

پتلونیں، سینٹ لورین کی شرٹیں، کالون کلین، سینٹ مائیکل... غرض یہ کہ کیا کچھ نہیں تھا۔

میں اسی کیفیت میں تھا کہ چیخوف کی آواز سنی ''کاسموپلٹین ہال میں ایک تقریب میں شرکت کرنا ہے، لہٰذا جلدی تیار ہوجائیں۔'' یہ بات سن کر میں حیرت اور خوشی کے دریا سے نکل آیا، مجھے جلدی کرنا تھی۔

بہتر ہوگا کہ چیخوف اور آپریٹر کی طرح میں بھی اسپورٹنگ کپڑے پہنوں۔ یہ یہاں کا فیشن لگتا ہے۔ ذہن نے اپنا اندازہ ظاہر کیا۔

ایک سفید پینٹ اور نیوی بلیو رنگ کی اسپورٹ شرٹ نکال کر پہنی۔ ہلکے نیلے رنگ کے جاگر پہن کر میں باہر نکل آیا۔ چیخوف میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور آپریٹر سے کہنے لگا، ''انتونیو! ہمارا دوست اسمارٹ ہے نا؟''

''ہاں! نووارد یہاں کے فیشن سے بھی واقف لگتا ہے!'' انتونیو نے تعارفی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے چیخوف کو جواب دیا۔

''آڈیو!'' کہہ کر ہم نے آپریٹر سے اجازت لی اور پھرتی سے باہر نکل آئے۔ سامنے ایک کشادہ راستہ تھا جو کہ تاحدِ نظر سیدھا تھا۔ راستے کے کنارے پر فٹ پاتھ تھا۔ اس کے ساتھ ایک چار فٹ گہری اور سات فٹ چوڑی کنکریٹ جیسے میٹریل سے تیار کردہ نالی تھی۔ چیخوف نے دائیں ہاتھ کے فٹ پاتھ پر چلنے کا اشارہ کیا اور خود اچھل کر فٹ پاتھ پر ہوگیا۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی کے ساتھ تھاما۔ میں نے فٹ پاتھ پر پیر رکھا ہی تھا کہ فوراً ایک جھٹکا محسوس کیا۔ شکر ہے کہ چیخوف نے میرا ہاتھ مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا تھا وگرنہ میں پشت کے بل جا گرتا۔

چیخوف نے ہاتھ چھوڑتے ہوئے نرم لہجے میں کہا، ''اب سکون سے چلتے رہیں۔''

میں نے دیکھا کہ فٹ پاتھ ہمارے پیروں تلے تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔

''موونگ پاتھ کی اسپیڈ بڑھتی جائے گی۔ جب آپ کو کہیں رکنا ہو تو اس ریلنگ کو پکڑ لیں۔ اسپیڈ ختم ہوجائے گی اور آپ قدم بڑھا کر روڈ پر اتر سکیں گے۔''

چیخوف اپنی مخصوص خوش دلی کے ساتھ مجھے تفصیلات بتانے لگا۔ وہ نہایت خوش

مزاج اور اپنائیت بھرا انسان تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ میرا کوئی دیرینہ شناسا ہو۔ میں نے ہنستے ہوئے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا۔

''اور نہیں تو کیا؟'' چیخوف نے پُرجوش لہجے میں کہا، ''تم مجھ سے اچھی طرف واقف ہو، میں اینتون چیخوف ہوں، تم میری کہانیاں بھی ترجمہ کر چکے ہو۔''

''آہا!'' میں نے خوشی کے مارے اچھلتے ہوئے کہا۔ ''آپ خود! میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے پتا تھا کہ تم آ رہے ہو، لہٰذا میں خود تمھارا استقبال کرنے کے لیے چلا آیا۔ تم نے آتے آتے بہت دیر کر دی۔'' چیخوف نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں میں تو ان سے اصرار کر رہا تھا کہ مجھے پیش کریں...'' میں نے یاد کرتے ہوئے کہا، ''لیکن انھوں نے مجھے پیش کرنے سے انکار کر دیا اور میں ضد کرتا رہا۔''

چیخوف نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

''ان بے چاروں کا کیا قصور، وہاں کوئی ہوتا تو تمھیں پیش بھی کرتے... ہا... ہا... ہا... تم نے اس بحث میں پانچ دن ضائع کر ڈالے۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے آنکھ ماری اور ہم دونوں قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔

''آپ نے سفید چولے والے کو کیا دیا تھا؟'' میں نے پوچھا، میرے ذہن میں وہ پلاسٹک کی ڈبیا گھومنے لگی۔

''کیوں؟'' ہم نے اسے تمھاری رسید دی تھی۔ یہ کمپیوٹرائزڈ ڈسکیٹ تھی، جس میں تمھاری مکمل تفصیلات موجود ہیں۔''

''کیا مطلب؟ میرے تمام اعمال، سارے کرتوت؟'' میں نے مشکوک ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ تم انسان ہو، مجھے تم پر فخر ہے!'' اس نے میری حوصلہ افزائی کرتے

ہوئے کہا۔ ''تم نے جو کچھ کیا وہ عین فطری تھا۔ تم نے کبھی بھی انسانی جبلتوں سے منہ نہیں موڑا تھا۔''

اب مجھے وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں، جو کہ سفید چولے والے نے مجھ سے کی تھیں۔ الجھے ہوئے ذہن میں کوئی بھی بات صحیح طور پر نہیں بیٹھ رہی تھی، یہ سب کچھ کیا ہے؟ سفید چولے والے نے مجھے 'دوزخی' کہا تھا، 'ملعون' قرار دیا تھا اور لاکر اس بھلے انسان چیخوف کے سپرد کر گیا تھا۔ یہاں تو ہر قسم کا سکون نظر آ رہا تھا، ماحول بھی اچھا تھا۔ موسم بھی دل کش تھا، آخر یہ کون سی جگہ تھی؟ مجھے تو دوزخ میں جانا ہوگا۔ ایسا کب ہوگا؟ یہاں میں ان مہربانوں سے کس قدر قربتیں بڑھاؤں؟

چیخوف کا ساتھ جانے کتنے لمحے نصیب رہے گا؟ میرا ذہن غوطے کھا رہا تھا۔

''نووارد!'' چیخوف کی آواز نے مجھے اس کیفیت سے باہر نکالا، ''دھیان کدھر ہے؟ موونگ پاتھ سے اترنا ہے، جیسے ہی میں چھلانگ لگاؤں تم بھی کود آنا۔''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اقرار میں گردن ہلائی۔ چیخوف نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ موونگ پاتھ کی رفتار بہت کم ہوگئی ہے۔ چیخوف نے مجھے کھینچتے ہوئے روڈ پر چھلانگ لگادی۔ میں بھی اس کے ہمراہ کود کر روڈ پر آ گیا اور ہم دونوں خراماں خراماں سڑک پر چلنے لگے۔ اب ہم شہری آبادی میں پہنچ چکے تھے۔

میں حیرت کے ساتھ عمارتیں دیکھنے لگا۔ یہ بہت خوب صورت تھیں۔ ان کے باہر بڑے بڑے گملے رکھے ہوئے، جن میں پیارے پیارے پودے لگے ہوئے تھے۔ مجھے درخت کہیں بھی دکھائی نہ دیے۔

''تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' چیخوف نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! کیا؟'' میں نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے ذہن کو حاضر کیا۔ اس کی پریشانی چہرے پر نقش تھی۔ اب مجھے اس کا سوال سمجھ میں آنے لگا۔

''طبیعت بالکل ٹھیک ہے، صرف ذہن الجھا ہوا ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟''

''ہا ہا ہا... یہی وہ جگہ ہے جو تم نے خود چاہی تھی۔ ہا ہا ہا!'' اس نے طویل قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''یار یہ میری غلطی ہے۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں تمھیں پوری بات تفصیل سے بتادیتا تاکہ تمھیں پریشانی نہ ہوتی۔ دراصل میرا ارادہ یہ تھا کہ پہلے چل کر کیفے ڈی لبرلز☆1 میں بیٹھیں گے۔ پھر میں تم کو کاسمولا جیکل تبدیلیاں سمجھا دوں گا۔'' اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے آپ کی کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔''

اس کے ہونٹوں پر اپنائیت بھری مسکراہٹ ابھری۔ سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ مجھے ایک وسیع کشادہ احاطے کی طرف لے گیا، جہاں کسی میٹریل کی بنی ہوئی آرام دہ کرسیاں اور ٹیبل رکھی ہوئی تھیں، بالکل یوں لگتا تھا جیسے ہم قدیم پیرس کے کسی ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے ہوں۔

ایک کارنر ٹیبل کے گرد جا بیٹھے۔ چیخوف ایک بڑے بکس سے تھرماس نما جگ اور دھات کے بنے ہوئے گلاس لے آیا۔ جگ سے گلاس بھر کر مجھے دیا جو میں نے فوراً پی لیا۔ فرحت کا احساس تھا کہ ہر گھونٹ کے ساتھ معدے میں اترتا چلا گیا۔ میں بڑے سکون سے ٹانگیں پھیلا کر چیخوف کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے گردن کو تعریفی انداز میں ہلاتے ہوئے کہا، ''ربیل اسکوائش☆2 ہے، یہاں کا مقبول مشروب...''

اس نے جگ انڈیل کر دوبارہ گلاس بھرا، میں نے کسی حریص بچے کی طرح غٹرغٹر کر کے خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔ اس نے پھر گلاس بھر دیا، اس کے لبوں پر مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ وہ بولا، ''یہ دوزخ ہے! یہ تم نے اپنے اعمال اور انکار سے حاصل کیا ہے، اب تمھیں یہیں رہنا ہے۔ کوئی طاقت تمھیں یہاں سے نکال نہیں سکتی، یہ یقین رکھو۔'' چیخوف نے اعتماد کے ساتھ مسکراتے ہوئے مجھے یقین دلاتے ہوے، میری ذہنی الجھنیں

☆1. Cafe de Liberals
☆2. Rebal Squash

دور کرنے کی کوشش کی۔

''یہ دوزخ ہے؟... لیکن!'' میں زیرِ لب بڑبڑایا، ''لیکن... کہتے تھے کہ وہاں آگ ہوگی۔ سانپ بچھو ہوں گے۔ تپتی ہوئی سلاخیں ہوں گی...''

''خطرناک فرشتے ہوں گے...'' اس نے میرا جملہ پورا کیا۔

''دوست یہ سب کچھ یہاں تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ تھا۔ یہاں نیوکلیئر فیوزن ہوتی رہتی تھی۔ سارے ماحول پر ریڈیشن طاری تھی...'' چیخوف دوزخ کی کیمیائی ساخت کے بابت بتاتا رہا۔ یہ تفصیلات نہایت دل چسپ تھیں۔

''آپ نے تو پوری زندگی ڈرامے اور افسانے لکھے ہیں۔ یہ سائنس کہاں سے پڑھی؟'' میں نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔

''ہاہاہا...'' اس نے خوش دلی کے ساتھ قہقہہ لگایا۔

''اتنی سائنس تو کچھ عرصے میں تمھیں بھی آجائے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ ساری دنیا کے سائنس دان، ہنرمند، کھلاڑی، دانش ور، جری، باغی سب کے سب اپنے سائنسی عقائد کے باعث یہاں بھیجے گئے تھے۔ سارے ذہین انسان یہاں جمع ہوگئے۔ ابتدا میں انھوں نے اس جگہ کو تبدیل کرنے کی خواہش کی۔ باقی خوف زدہ تھے، ان لوگوں نے تعاون نہ کیا۔ لیکن پھر ان کا خوف بھی ختم ہوگیا۔ کیوں کہ یہاں موت تو تھی ہی نہیں۔ لوگ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بھی دوبارہ اٹھ کھڑے ہوتے۔ سائنس دانوں کی راہبری میں بڑی محنت کے بعد سارے عناصر (Elements) کو ایک دوسرے سے جدا کرکے الگ الگ رکھا گیا۔ سانپوں اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کو کیمیائی چھڑکاؤ کرکے ختم کردیا تھا۔ دھات تلاش کرکے ان سے مختلف اوزار تیار کیے گئے۔ بڑی بڑی بھٹیوں اور آگ کے الاؤ کے سبب دھات کو پگھلانا آسان تھا...'' چیخوف کیمیائی انجینئرنگ کے کارناموں پر روشنی ڈالتا رہا اور میں حیرت کے ساتھ انسانی حوصلے اور عظمت کی داستان سنتا رہا۔

چیخوف کہہ رہا تھا، ''یہاں کے ماحول کو خوش گوار بنانے کے لیے ماہوار سیارے چھوڑے جاتے ہیں، یہاں کی سرزمین میں معدنیات بہت زیادہ ہیں۔ ریڈیم، رتجیم،

رائنس یہاں مل جاتی ہیں اور ہماری سائنسی ایجادات ان ہی کی طاقت کے بل بوتے پر چلتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی زمین میں درخت پودے نہیں اُگتے۔''

''لیکن یہ پھول اور پودے؟'' میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں! یہ ہم نے کیمیائی مٹی بنا کر اس میں بوئے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ یہ بڑے فریک برتنوں میں اُگے ہوئے ہیں...'' اس نے گردن اٹھا کر فضا میں گردش کرتی ہوئی ایک رنگین تھالی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب وقت ہو چکا ہے، ہمیں فنکشن میں پہنچنا ہے۔ آہستہ آہستہ آپ کو ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی، آیئے۔''

وہ آہستگی سے اُٹھا۔ جگ گلاس اٹھا کر الگ الگ خانوں میں رکھ آیا۔

ہم نے دھیرے دھیرے سامنے موجود چوک کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ ہمارے علاوہ بھی کئی افراد خوش وخرم خراماں خراماں ادھر کو ہی چل رہے تھے۔

''یہ آرک نیگیشن یعنی انکار والی محراب ہے۔'' چیخوف نے داہنے راستے کی طرف اشارہ کیا۔ قدرے فاصلے پر ایک محراب دکھائی دی جو پرے ہونے کے باوجود حسین نظر آ رہی تھی۔

''یہ یادگار اس میٹنگ کی ہے جس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہم دوزخ کی اس حالت کو قبول نہیں کرتے، ظلم اور زیادتی کی زمین پر بھی مخالفت کی تھی اور ہم اس کی یہاں بھی مخالفت کرتے ہیں اور آزادانہ ماحول میں حالات بہتر کرنا چاہتے ہیں۔ اس جگہ کو رہنے کے قابل بنائیں گے۔ جہاں کسی پر کوئی الزام نہ ہو، ہر کوئی خوش باش رہ سکے۔ کوئی کسی کا مقروض نہ ہو۔ محض چند انسانی فرائض ہوں گے جو ہر کسی پر لاگو ہوں گے اور بس، ہم عزم کرتے ہیں کہ ہم انسانیت کی برتری قائم کریں گے...'' چیخوف بتا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں تعظیم تھی، میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا حسین چہرہ پروقار تھا۔ وہ مجھے بہت بھلا لگ رہا تھا۔

ہم کاسموپولیٹین ہال پہنچے۔ یہ ایک بہت بڑی عمارت تھی، جو سیکڑوں فٹ بلند تھی، یہ گول شکل میں تھی۔ اس کی بیرونی دیوار کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لفٹ موجود

تھیں۔ چیخوف ایک لفٹ کی جانب بڑھا اور ہم دونوں اس پر سوار ہوکر آٹھویں منزل پر جااترے۔ کوریڈور میں دیوار پر آٹھ کا عدد رومن رسم الخط میں لکھا ہوا تھا، اس کے ذیل میں لٹریچر لکھا ہوا تھا۔ کوریڈور میں کئی دروازے تھے، جن پر نمبر لگے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان شخص نے ہاتھ لہرا کر چیخوف کو متوجہ کیا۔

''آندرے مارکس ہے۔'' اس نے تعارف کراتے ہوئے کہا، ''یہ نوارد...''

ہم نے مصافحہ کیا۔ میں اس کی کتابیں پڑھ چکا تھا۔ ہم نے آپس میں خیر سگالی کے الفاظ کا تبادلہ کیا۔ کسی نے آ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ گردن موڑ کر دیکھا تو کرشن چندر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ رہنے والی من موہنی مسکراہٹ تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا، میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے ذہن پر زور ڈالا۔

''ارے کیوں؟ الجھ گئے؟...'' کرشن چندر نے ٹوکا، ''حسرت موہانی ہے...'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں اس حلیم طبع باغی سے بڑی محبت اور تعظیم کے ساتھ ملا۔ سامنے ایک مرد اور ایک عورت آتے دکھائی دیے۔ مرد کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اسے میں نے پہچان لیا۔ ''سارتر!'' میں چلا اٹھا۔ سارتر نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنی ساتھی کا تعارف کرایا۔ ''سیمان دی بوار! ابھی ابھی یہاں پہنچی ہے۔''

مجھے یاد آیا کہ حال ہی میں اخبار میں اس کی موت کی خبر پڑھ چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی حال ہی میں مرا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ذہن میں گزرتے وقت کا سایہ ابھرا۔

''آپ برصغیر کے رہنے والوں کا آپس میں ملنے کا طریقہ بہت پیارا ہے۔'' دی بوار تعارف کے بعد مسکراتے ہوئے بولی۔

ہم سب ہنستے کھیلتے، ایک باکس میں داخل ہوئے۔ سامنے فرش کے عین بیچ اسٹیج بنا ہوا تھا۔ اسٹیج کے چاروں اطراف شیشے لگے ہوئے تھے، یہ ایک بڑا تھیٹر ہال تھا۔

''اسٹیج کے چار اطراف میگنیفائنگ گلاس لگے ہوئے ہیں۔ ان کی فوکل لینتھ، کانسٹینٹلی ایون (Constantly even) ہے۔ اسٹیج پر آنے والی ہر شے اپنی حقیقی قامت سے کئی گنا زیادہ بڑی نظر آئے گی۔ اس طریقے سے اتنے بڑے ہال میں موجود تمام لوگ پروگرام کو اچھی طرح سے دیکھ سکیں گے۔'' چیخوف نے اسٹیج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے حیرت اور خوشی کے مارے گردن کو تعریفی انداز میں ہلایا۔

''ذہین لوگوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ جہاں بھی رہیں، زندگی کو سہل بنائیں۔'' حسرت موہانی نے تعریف کرتے ہوئے کہا، ''آہا! گور کی بھی آ گیا!'' چیخوف خوشی سے چلایا۔

میں نے گردن موڑ کر دیکھا، ایک طویل قامت بارعب شخص ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس سے مل کر ہم سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دھیمی مدھر موسیقی فضا میں پھیلی ہوئی تھی، جو سکون دے رہی تھی۔ ہال میں اس قدر ہجوم کے باوجود کسی بدمزگی کا احساس تک نہیں تھا، ٹھنڈک لگ رہی تھی۔

''یہ دوزخ کی بھٹی ہے۔'' چیخوف نے اسٹیج کی بنیادوں کی طرف اشارہ کیا۔

''دوزخ علم کے مقابل تو نہیں ٹھہر سکتی۔ اب یہاں کاسموپولیٹن تھیٹر ہے۔'' سارتر نے کہا۔

بلاشبہ جہنم کا وجود ہی اس وقت تک ہے، جب تک لاعلمی اور وہم ہے، علمی اور فکری جدوجہد کے ساتھ ایسی چیزوں کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔'' میکسم گورکی نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''دوزخ کی بھٹی! کیا سمجھے۔ ہم دوزخ کی تہ میں بیٹھے ہیں۔'' کرشن چندر میری جانب جھک کر شرارتی لہجے میں بڑبڑایا۔ کرشن کی اس بات نے خوش گوار موسم کے احساس میں مزید اضافہ کیا۔

میکسم گورکی نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور پوچھنے لگا، ''آپ کے سندھی ادب کا جہنم کے بابت کیسا رویہ ہے؟''

دھک... دھک... دھڑ... دھڑ... دھڑ کی زوردار آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔ آنکھیں کھول کر چارپائی پر اٹھ بیٹھا۔

''روزے دارو... اٹھو... روزہ رکھو...'' دین کے دوست دروازے اور ڈھول بجا کر لوگوں کو جگا رہے تھے۔

دل تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا، پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ عجیب سی الجھن طاری ہوگئی تھی، زیر لب بڑبڑایا، ''دوزخ میں ہی اچھا تھا۔''

میں تکیہ سیدھا کر کے پھر سو گیا۔

اثر

''پاس...''

کرنل صاحب نے نچلا ہونٹ دباتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی پہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور اپنی بائیں جانب بیٹھے حسن کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''پاس۔'' حسن نے کہا۔

''ون کلب۔'' سامنے بیٹھا مسعود زیرِ لب بڑبڑایا۔ اس نے گردن بالکل بھی اوپر نہیں اٹھائی تھی۔ اس کی نگاہیں پتوں پہ جمی رہیں۔

کرنل صاحب کی بھنوؤں کے بیچ پیشانی پر دو عمودی لکیریں ابھر آئیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے پیروں پہ دباؤ ڈالتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑایا، ''ہوں!''

''ٹو اسپیڈ!'' الطاف نے نعرہ بلند کیا۔

''پاس۔'' کرنل صاحب نے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ مسعود کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی عقابی نظریں مسعود کے اندر جھانکنے کو بے تاب تھیں مگر مسعود نے تو اوپر دیکھا ہی نہیں۔

''پاس۔'' حسن نے بھی نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

کرنل صاحب بے قراری کے عالم میں مسعود کی جانب دیکھتا رہا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے مسعود پہ اعتماد نہیں تھا۔

''تھری کلب۔'' مسعود نے اسی آہستگی کے ساتھ کہا، اس نے آنکھیں اوپر نہیں کی تھیں۔

''فور نو ٹرمپ۔'' الطاف نے نعرہ لگایا۔

''پاس۔'' کرنل نے اس لہجے میں کہا گویا وہ مسعود کو تنبیہ کر رہا ہو۔ اس کی نظریں اک پل کے لیے بھی مسعود کے چہرے سے ہٹی نہیں تھیں۔

''فائیو اسپیڈ۔'' حسن یہ کہہ کر مسعود کی طرف دیکھنے لگا جیسے اسے یقین ہو کہ مسعود اسے گیارھواں ہاتھ لینے کی تکلیف سے بچائے گا۔

''سکس کلب۔'' مسعود نے اسی آہستگی کے ساتھ کہا۔ لیکن اس بار اس کے لہجے میں اک قسم کی پختگی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ طیش میں تھا۔

الطاف نے طویل سانس لیتے ہوئے سکون کے ساتھ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا، ''پاس۔''

اس کے لہجے نے کرنل صاحب کو آگ بگولہ کر دیا۔ اس نے پتے سمیٹ کر زور سے ٹیبل پہ پھینکے۔ مسعود کی جانب چہرہ کرتے ہوئے کہا، ''کبھی تو آنکھیں اٹھا کر اوپر بھی دیکھا کرو۔'' اس کا لہجہ سخت تھا۔

''اِٹ از امپاسیبل ٹو پلے برج وِدتھ یو! آپ کبھی تو اپنے ساتھی پر بھروسا کیا کریں۔''

''میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میرے پاس پتے نہیں ہیں، پھر بھی آپ بیٹ بڑھاتے جا رہے ہیں؟ جب وہ خود ہمیں موقع دے رہے ہوں تو آپ پاس بولیں، میں ڈبل کروں!''

مسعود نہایت سنجیدہ چہرے کے ساتھ کرنل صاحب کی آنکھوں میں دیکھتا رہتا ہے اور کرنل صاحب کا غصہ بڑھتا جاتا ہے۔

مسعود کے چہرے پر کوئی بھی ردِعمل نظر نہیں آتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ یہ بات پہلے ہی اندازہ کر چکا تھا۔ اسے کرنل صاحب کے اس عمل پر کوئی حیرت تھی، نہ خوف اور نہ ہی کوئی غصہ۔

''آپ برج تنہا کیسے کھیلیں گے؟ یہ تو مل کر کھیلنی پڑتی ہے!'' کرنل صاحب نے غصے، حیرت، بے اعتمادی، دکھ اور تکلیف کے احساس یک جا کر کے درشت لہجے میں کہا۔

حسن اور الطاف اس معاملے سے قطعی لاتعلق دکھائی دے رہے تھے۔ الطاف نے پتا پھینکتے ہوئے 'لیڈ' کی اور ہاتھ کے اشارے سے کرنل صاحب کو پتے کی طرف متوجہ کیا۔

کلب میں یہ میرا پہلا دن تھا اور ان چاروں یاروں سے پہلا تعارف۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ چاروں افراد یوں ہی اک دوسرے سے روزانہ شرط لگا کر کھیلتے رہتے ہیں۔

مسعود کو میں نے جس انداز سے دیکھا، اس کی وجہ سے میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے کرنل صاحب کو عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔ میں نے اس کے رویے میں ایک لمحے کو بے چینی بھی محسوس کی تھی۔ کیوں کہ معزز لوگوں کی محفلوں میں اس طریقے سے خیالات کا اظہار غیر مہذب سمجھا جاتا ہے۔ ہم میں سے کسی کو بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم کسی کو اس لہجے میں مخاطب کریں، وہ بھی باآوازِ بلند۔ بھری محافل میں تو ہر کوئی اس بات کا خیال رکھتا ہے لیکن جب میں نے مسعود کی طرف دیکھا تو وہاں مجھے شکایت کے بجائے اک سکون نظر آیا۔

کسی جھیل میں برسوں کا کھڑا پانی جس میں کوئی لہر تھی نہ موج۔ ہاں البتہ ایک اَن کہا انکار ضرور تھا، یا پھر یہ میرا فہم تھا۔

نیچے جھکی پلکیں اس کے اس تاثر کو اس قدر نمایاں کر رہی تھیں کہ کرنل صاحب کی غصے میں نیم وا آنکھیں بھی اس کے چہرے کے تاثر کو باآسانی پڑھ سکتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کرنل صاحب کا غصہ اور تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔

کرنل صاحب کی عمر قریباً پچپن برس تھی یا مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ وہ آرمی سے ریٹائر ہو چکا تھا اور اب اک کارپوریشن میں کنٹریکٹ کی نوکری تھی۔ سر پر چھوٹے چھوٹے سفید بال، گول چہرے پہ کلف لگی مونچھیں اس کی شخصیت کو روایتی رعب عطا کر رہی تھیں۔ اس کی ہر حرکت کسی سخت مزاج فوجی حوالدار جیسی تھی۔ آواز میں گونج، ہر جنبش میں جھٹکا، تنا ہوا بدن اور رنگت سرخی مائل بھوری تھی۔

مسعود کے بال مٹیالے تھے اور وہ پچاس سال کا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ہر حرکت سست، کندھے جھکے اور چہرے پہ شگفتگی کا تاثر۔ البتہ بال اس کے بھی فوجی انداز میں کٹے ہوئے تھے۔

میں روزانہ ان چار یاروں کی برج دیکھنے لگا۔ مجھے مسعود میں دل چسپی محسوس ہوئی تھی۔ کلب میں کوئی بھی کسی کے بارے میں بات نہیں کرتا تھا یا پھر شاید میں نووارد تھا۔ پرانے ممبرز ابھی مجھ پر اعتماد نہیں کر پائے تھے۔ اس لیے کسی بھی نوعیت کا تبصرہ کرنے سے گریزاں ہوں گے۔ یا پھر ممکن ہے میری کم گوئی کی عادت کی وجہ سے کسی نے میرے ساتھ اتنی بے تکلفی محسوس نہ کی ہو کہ کھل کر گفت وشنید کرسکتا۔ بہرکیف جو بھی وجہ ہو مجھ تک کرنل صاحب اور مسعود کے متعلق کوئی معلومات نہیں پہنچی تھیں۔

مسعود کی مستقل عادت رہی، وہ غلطیاں کرتا رہا اور کرنل صاحب انتہائی شدومد کے ساتھ ان غلطیوں پر تنقید کرتا رہا۔ نصیحتیں کرتا رہا۔ اس کے لہجے کی تلخی، آنکھوں کی تیزی اور غصے کا اندازہ وہی رہا۔

اس کے برعکس مسعود کا اطمینان وسکون کمال درجے کا تھا۔ وہ کبھی بھی لمحہ بھر کے لیے بے چین نہیں ہوا تھا۔ اس کی خاموشی کسی بڑے مدبر جیسی تھی مگر میں نے دیکھا تھا کہ وہ اپنی غلطیوں سے سیکھتا بالکل نہیں تھا۔ میں خود برج کا کوئی اچھا کھلاڑی تو نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ غلطیاں بھانپ لیتا تھا اور ہمیشہ حیران ہوتا تھا کہ مسعود آخر وہ غلطیاں دُہراتا کیوں ہے؟

میرا انداز یہ تھا کہ مسعود کرنل صاحب کی بات سنتا ہی نہیں ہے۔ کرنل صاحب کو جو بات کہنی ہوتی ہے، جب وہ اپنی بات ختم کرلیتا ہے تو پھر مسعود اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا، وہ ہر لفظ انتہائی توجہ اور تحمل سے سنتا اور سمجھتا تھا۔ البتہ وہ ان پر عمل پیرا ہونے سے گریزاں رہتا تھا۔

میں نے یہ بات دیکھی تھی کہ کرنل صاحب درست 'کال' دیتا تھا۔ وہ برج کے کلاسیکل اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ ترغیبی جھکاؤ دیتا تھا جو لطف دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں کرنل صاحب کے پہلو میں بیٹھتا تھا تاکہ کھیل کے رموز سمجھ سکوں۔ جب

مسعود پتے کھولتا تھا اور 'ڈمی' ہو جاتا تھا اور کرنل صاحب کھیلتا تھا تو وہ اٹھ کر ہال سے باہر نکل جاتا تھا۔ مجھے اس بات پہ حیرت ہوتی تھی کہ وہ آخر ایسا کیوں کرتا تھا؟ اسے کرنل صاحب کا کھیل دیکھنے سے کھیل سیکھنے کا اچھا موقع مل سکتا تھا۔ وہ فارغ بیٹھ کر اچھے طریقے سے سیکھ سکتا تھا۔

بالآخر ایک روز مجھے یہ پتا چل گیا کہ مسعود کرنل صاحب کا بھتیجا تھا اور وہ کرنل صاحب کے محکمے میں ہی اس کے جونیئر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ جب وہ کھیل کے دوران ہال سے باہر جاتا تھا تو اس کی واحد وجہ اس کی تمباکو نوشی کی عادت تھی۔ کیوں کہ وہ کرنل صاحب کے سامنے سگریٹ نوشی کا تصور ہی نہیں کرسکتا تھا۔

کرنل صاحب زندگی میں مقرر کردہ اصولوں پر سختی سے کاربند تھا، وہ بے ترتیبی کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کا یہ ایمان تھا کہ غلط بات کو نہ صرف غلط کہا جائے بلکہ باآوازِ بلند کہا جائے۔ اس کی مخالفت کی جائے اور اس کو درست کیا جائے۔

مجھے کلب جاتے ہوئے بہ مشکل ہفتہ بھر گزرا تھا۔ میں حسبِ معمول بیٹھا ان کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ اس روز مسعود اچھا کھیلا۔ کرنل صاحب، ''چکر کیا ہے— چکر کیا ہے؟'' کی ہی گردان کرتا رہا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ اگر کوئی بھی کھلاڑی ایسی چال چلتا تھا، جس کی وجہ سے اسے سوچنا پڑتا تھا تو پھر وہ یہ الفاظ دُہراتا جاتا تھا اور سوچتا رہتا تھا۔

مسعود نے فائیو اسپیڈ (گیارھویں گولے) لوٹا دیے تھے، اس کے پتّوں میں ایک کلب (چڑیا) اور ایک ڈائمنڈ (اینٹ) لوزر (کار) تھے۔ اس نے رنگ نکلوانے کے بجائے پان کے پتّے کو ڈمی سے نچلا رف کرا کے (کٹوا کے) اپنے رنگ کا سہارا لیا۔ بعد میں دوسری چال چلتے ہوئے اینٹ کے گولے سے سودا کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس طرح اس نے سمال سلیم کیا۔ یعنی گیارہ ہاتھ لیے۔

میں اپنے آپ کو روک نہ سکا، منہ سے بے اختیار ''واہ وا!'' نکل گیا۔ کرنل صاحب نے اپنی تیز نگاہوں سے مجھے بغور دیکھا۔ میں نے مسعود کی طرف دیکھا، جس نے آنکھیں اوپر کرکے پل بھر کے لیے کرنل صاحب کی جانب دیکھا تھا، پھر اس نے اپنی

نظریں جھکا لیں۔

''ون ہرٹس۔'' حسن نے بیٹ بڑھائی۔

''ون اسپیڈ۔'' مسعود نے کہا۔

''ٹو ہرٹس۔'' کرنل صاحب نے کال دی، جس سے اس کی مراد یہ ہوسکتی تھی کہ پتا نہیں ہے اور یہ مسعود کے لیے اشارہ تھا کہ وہ بے شک شرط کو بڑھاوا دے۔

مسعود نے ''تھری ڈائمنڈ'' کہہ کر اپنے پاس اینٹ کے پتّوں کی موجودگی سے باخبر کیا۔

الطاف نے 'پاس' کردیا۔ 'فور اسپیڈ' کرنل صاحب نے اپنی مدد کے متعلق اشارہ کیا۔ اس مرتبہ وہ پریشان نہیں لگ رہا تھا۔ 'پاس' کہہ کر حسن نے کال آگے بڑھائی۔

''فور نو ٹرمپ'' مسعود نے کرنل صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے ہولے سے کال دی۔

جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ وہ کرنل صاحب سے پوچھ رہا تھا کہ اس کے پاس کتنے یکے ہیں۔

'پاس۔' الطاف نے حسبِ سابق کہا۔

'فائیو ہرٹس۔'' کرنل صاحب نے کہا۔

جس سے مراد یہ تھی کہ اس کے پاس دو یکے ہیں۔

اب مسعود کے پاس اس قدر معلومات تھیں کہ وہ اپنے اصل کھیل کا اعلان کرسکے۔

اس نے دھیرے سے کال دی، ''سکس اسپیڈ۔''

کرنل صاحب نے اطمینان کے ساتھ اپنے پتّے سمیٹ کر مسعود کو تھمائے اور اس کے ہاتھوں سے پتّے لے کر دیکھنے لگا۔

اس وقت میں مسعود کے پتّے دیکھ سکا۔ میں ہمیشہ کی طرف کرنل صاحب کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ مسعود نے واقعی نہایت سمجھ داری سے جوابی چال چلی تھی۔ کرنل صاحب نے آہستہ سے گردن ہلائی۔

مسعود نے یہ کھیل بھی بہت اچھا کھیلا تھا۔

کھیل ختم ہونے پر کرنل صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے گردن کے اشارے سے ''واہ وا'' کہا۔ کرنل صاحب نے گویا سُر ملاتے ہوئے کہا، ''ویل پلیڈ!... ویری ویل پلیڈ!''

مسعود کے اطمینان بھرے چہرے پر اک لمحے کے لیے تشویش نظر آئی تھی۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا میں نے اس کے چہرے پر پریشانی دیکھی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، ان میں عجیب قسم کی عجلت اور الجھن دکھائی دے رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ آخر ایسا کیوں؟

مسعود کا سکون اور اطمینان ایک تعریفی لفظ سے ختم ہوا تھا جس طرح اک چھوٹا سا پتھر بڑی جھیل کے ساکن پانی کو متلاطم کر ڈالتا ہے۔

مدتوں کا کھڑا پانی ایک ذرا سی لہر کی اچھال سے تلاطم کا شکار ہو گیا تھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

کرنل صاحب حسبِ روایت کھیل کے پہلوؤں پر اور کال دینے کے لطیف رموز پر گفتگو کرتا رہا۔ میں اس کے یہ قیمتی کلمات سننا چاہ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ میرا ذہن مسعود کی حالت کے متعلق بھی سوچتا رہا۔

مسعود نے کال دی، پتے کھلنے کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ اس نے یہ کال بالکل اسی طرح دی تھی جس طرح کچھ دیر پہلے کرنل صاحب سمجھاتا رہا تھا۔

مجھے شدید حیرت ہوئی تھی کہ مسعود نے کرنل صاحب کی بات سنی اور مان لی تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا۔

کھیل ختم ہونے کے بعد کرنل صاحب نے میری طرف دیکھے بنا مسعود کے کھیل کی تعریف کی۔

میں نے مسعود کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون کے بجائے پریشانی طاری دکھائی دی۔

اس کی پیشانی پر ننھے ننھے قطرے بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے میں الجھن میں گرفتار ہوگیا۔ اس کا اطمینان مجھے پہاڑ جیسا لگتا تھا لیکن اس کا یہ سکون اس وقت غائب تھا۔

اس نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر کر انھیں تر کیا اور پتے بانٹنے لگا۔ اس کے کپکپا رہے تھے۔

نوٹ: یہ ترجمہ لغات کی مدد سے مکمل کیا گیا ہے۔ تاش کے کھیلوں سے عدم واقفیت کے باعث ترجمے کے متن میں اغلاط خارج از امکان نہیں۔ (ش ح)

بَین

اچانک گاؤں کی خاموش فضا میں رونے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ بین اور آہ و زاری کی آوازیں رفتہ رفتہ بلند ہونے لگیں۔ گاؤں میں کوئی وفات پا گیا تھا۔

یہ اک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ صبح کے وقت یہاں ہمیشہ خاموشی رہتی ہے۔ ہاری، چرواہے، کاشت کار، کنوارے، رنڈوے سب اپنے اپنے کام کاج میں جُت جاتے ہیں۔ عورتیں گھر داری کے کام کاج میں مصروف ہوجاتی ہیں۔ دوپہر کو جب کام سے فراغت ملتی ہے تو وہ آپس میں مل بیٹھتی ہیں۔ اپنے اپنے دُکھڑے روتی سناتی ہیں اور اک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹتی ہیں۔

گاؤں کی عورتیں ایک ایک کر کے کھوسوں☆ کے احاطے میں جا کر جمع ہو رہی تھیں اور مرد احاطے سے باہر واقع مولوی عبداللہ والی مسجد میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ مرد چپ چاپ بیٹھے تھے۔ البتہ احاطے سے مرحوم کی خوبیاں بیان کر کر کے بین کرنے اور دھاڑیں مارتے ہوئے رونے کی آوازیں اک ترتیب سے سنائی دے رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کافی کی طرز پر مشتمل کوئی پُرسوز راگ الاپا جا رہا ہو۔

سائیں داد کا بیٹا انتقال کر گیا تھا۔ وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ، چپ سادھے، ننگے سر، آنکھوں میں رات کی نشانیاں سمیٹے مردوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے کپڑے

☆ کھوسہ: سندھ میں آباد ایک قوم۔

میلے اور سلوٹ زدہ تھے۔ اس کے چھ بیٹے تھے، مرحوم ساتواں بیٹا تھا۔ اس کے ہاں کسی بچی کی ولادت نہیں ہوئی تھی۔ اس کی عمر قریباً چالیس ہوگی۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ تھوڑی بہت زمیں داری تھی اور کچھ مال مویشی بھی تھے۔ غرض یہ کہ اس کی اچھی بھلی گزر بسر ہو رہی تھی۔

احاطے میں چارپائی پر بچے کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ بچے کی پیدائش کو بہ مشکل دو ہفتے گزرے تھے کہ وہ بخار اور قے میں مبتلا ہو کر وفات پا گیا۔ چارپائی کے چاروں اطراف زمین پہ بیٹھی عورتیں بین کر رہی تھیں۔

''ارے بیٹا! یہ تیرے جانے کی عمر تھی کیا...'' مرحوم بچے کی دادی نے سُر میں بین کیا، ''بیٹا تم نے تو کچھ پہنا اوڑھا، نہ ہی زندگی کا سرد گرم دیکھا۔'' مائی ست بھرائی نے اس کا ساتھ دیا۔ وہاں موجود سب عورتیں ان جملوں کے زیر اثر کلبلا اُٹھیں۔ آہ وزاری کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

سائیں داد کی ماں مائی جامل گاؤں کی سب سے سمجھ دار عورت تھی۔ وہ بڑی سوجھ بوجھ کی عورت تھی۔ احاطے کی عورتیں گھریلو کام کاج، خوشی غمی، نشست و برخاست، غرض یہ کہ مائی جامل کے مشورے کے بنا کچھ نہ کرتی تھیں۔

دفعتاً مائی جامل ماتم کدے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے خیال آیا کہ لڑکے کے اوپر ریشمی چادر ڈالے۔ جتنی زیادہ چادریں پڑیں گی، گاؤں میں اسی قدر نام ہوگا۔ وہ سامان والی کوٹھڑی میں گئی اور لکڑی کا بڑا صندوق کھول کر ریشمی چادر تلاش کرنے لگی۔

صندوق کافی بڑا تھا جس پر بوسیدگی کے نشانات نمایاں تھے۔ گھسی ہوئی لکڑی چغلی کھا رہی تھی کہ صندوق بھی کم از کم مائی جامل جتنا ہی قدیم ہوگا۔ مائی جامل کو چادر ڈھونڈ نکالنے میں بڑی دقت ہو رہی تھی۔ اس نے صندوق سے اک اک کرکے رلّیاں☆ اور رضائیاں باہر نکالنا شروع کیں۔ لگتا تھا کہ صندوق میں چادر تھی ہی نہیں۔ مائی جامل صندوق کھنگالنے لگی۔

☆ رلّی: سندھ کا روایتی لحاف/کھیس نما بچھونا جو عورتیں رنگین کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی کترنیں ہی کر بناتی ہیں۔

اس کے چلنے آنے کے بعد بین اور آہ و بکا میں کافی فرق آ گیا۔ آوازیں دھیمی پڑ گئی تھیں۔ کبھی کبھار کسی سسکی کی آواز آجاتی۔ وگرنہ اس کے سوا کوئی خاص بات نہ تھی۔

یہ عالم دیکھ کر مائی ست بھرائی جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور مائی جاہل کو ڈھونڈنے لگی۔ ست بھرائی بھی مائی جاہل کی ہم عمر تھی۔ وہ خود تو بین کرنا اور آہ وزاری کرنا جانتی تھی، مگر ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ احاطے کی دیگر عورتیں کم عمر تھیں جن کو بین کرنے میں ساتھ دینا نہیں آتا تھا۔ یوں بین کرنے کا سلسلہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ مجبوراً مائی ست بھرائی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ہر کوٹھڑی کے اندر جاتی اور واپس آجاتی۔ اس کی جلد بازی اور بوکھلاہٹ دیکھ کر گمان گزرتا جیسے کوئی بڑا واقعہ رونما ہوگیا ہے۔ بالآخر ست بھرائی سامان والی کوٹھری میں جا پہنچتی۔ اس نے کمر پہ ہاتھ رکھ کر کہا، ''ارے بہن! یہ کیا زیادتی کر ڈالی ہے؟'' ست بھرائی نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''بہن! لڑکے کے لیے ریشمی چادر ڈھونڈ رہی ہوں، اس کے اوپر ڈالوں گی۔'' مائی جاہل نے بغیر گردن پھیرے عجلت میں جواب دیا۔

''خلقت کو لڑکیوں کے آسرے پر چھوڑ آئی ہو۔'' ست بھرائی نے شکایت کی۔ وقت کی نزاکت اور اپنی اہمیت کے احساس نے اس کی آواز کو پُراعتماد بنا دیا تھا۔

''کم بختوں کو لوگوں میں رونا ہی نہیں آتا، خود پہ زمانے کو ہنساؤ گی کیا؟''

''میں ان کا کیا منہ کالا کروں بہن! اب اتنی بڑی تو ہوچکی ہیں، ابھی کم سن ہیں۔ آخر میں ان کے ساتھ کب تک رہوں گی۔'' مائی جاہل نے بڑے پن کے ساتھ کہا۔ اپنی اہمیت کے احساس سے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی تھی۔

''بچیاں نہیں تو پھر کیا ہیں؟ دنیاداری کے رسم و رواج میں پڑیں ہی نہیں، انھیں ان باتوں کا کیا پتا۔'' ست بھرائی نے بات آگے بڑھائی۔

مائی جاہل نے صندوق کے نچلے حصے سے ریشمی چادر کھینچ کر باہر نکالی۔ صندوق کا ڈھکنا بند کرتے ہوئے اس نے کہا، ''چلو بہن! آخر ہمیں ہی سب کچھ کرنا پڑے گا۔''

دونوں بڑھیائیں جلدی جلدی آکر زمین پر چارپائی کے گرد بیٹھ گئیں۔

''ارے بیٹا ماں ہنسی خوشی تیرے لاڈ اٹھاتی...'' مائی جامل نے پُرسوز آواز میں بین کیا۔

''ماں کی گود خالی کیے جا رہے ہو... ارے ہائے... ہائے۔'' مائی سب بھرائی نے بین کرتے ہوئے سُر ملایا۔

''ساتوں کا ساتھ چھوڑے جا رہے ہو...'' مائی جامل نے دردناک شکایت کی۔

''ارے بچے اس صحن میں کھیلتے...'' مائی ست بھرائی نے سسکتے ہوئے ساتھ دیا۔

''ارے بیٹا یہ کیا ستم کر چلے ہو!''

گاؤں کی خاموش فضا میں بین کی آوازیں گونجنے لگیں۔

عوام

اگر چہ وہ بے مالک تھا مگر آوارہ نہیں تھا۔ اس کی زندگی دھوبی کے دروازے پر نہیں گزری تھی پھر بھی وہ دھوبی گھاٹ پر اکثر جایا کرتا تھا۔

اسے کسی دھوبی سے ہمدردی تو نہیں تھی مگر وہ پرانی نہر میں نہانے ضرور جاتا تھا۔ دوسرا یہ کہ وہاں اسے اپنا آپ دھونے کی لیے تھوڑا بہت صابن مل جاتا تھا اور اس کے سفید بال صاف ہو کر چمکنے لگتے تھے۔

اس کی یادداشت بالکل مختصر تھی۔ اپنی ماں کی یادیں بھی دھندلی سی تھیں یا پھر صرف اس شہر کی کچھ گلیاں اور کچھ لوگ جنھیں وہ دور سے سونگھ کر پہچان سکتا تھا۔ اس کے تعلقات بھی نہایت محدود تھے۔ ممتاز دھوبی کو وہ پہچانتا تھا جو کبھی کبھار اس کا خیال رکھا کرتا تھا۔ ملوک نانبائی کی دکان پر بھی اس کی کچھ نہ کچھ شناسائی تھی۔ مارکیٹ میں نگینہ قصائی بھی اس کا خیال رکھتا تھا۔

وہ گندگی کے ڈھیر پر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھار جب اس سے رہا نہ جاتا تو وہ رات کو چکر لگا لیتا تھا۔

اسے اپنی عزت اور لاج کا بہت خیال رہتا تھا۔

جب وہ چھوٹا تھا تو اسے اکثر خان بہادر صاحب کی حویلی سے گزرنے کا اتفاق ہوتا۔ وہاں وہ جاتا۔ وہ انسانوں کو کتوں کی خدمت کرتے دیکھا کرتا۔ ایسے مواقع پر اس کا

سینہ فخر سے پھول جاتا۔ وہ غرور کے ساتھ اپنے کان کھڑے کر لیتا تھا۔ مگر پھر وہ اپنی لاوارثی کا سوچتا تو اسے بہت رنج ہوتا۔

وہ اکثر سوچتا آخر اس میں کیا کمی ہے کہ اسے کوئی بھی ہمدردی سے نہیں دیکھتا۔ یہ بات جاننے کے لیے وہ پالتو کتوں کو غور سے دیکھتا رہتا۔ مگر اسے ان میں کوئی خاص بات دکھائی نہ دیتی۔ البتہ ایک بات جو اس نے محسوس کی وہ تھی صفائی۔ اس نے بھی صاف ستھرا رہنا شروع کر دیا۔ اب وہ پانی کے کنارے کھڑا ہو کر اکثر دیر تلک خود کو دیکھتا رہتا۔

وہ صفائی کے بعد تو خان بہادر صاحب کی حویلی کے بار بار چکر لگاتا۔ کئی دفعہ تو وہ باغ کے کسی خالی کونے میں بیٹھ کر رو بھی دیتا تھا۔ مگر اسے دل کھول کر رونے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ چوکی دار اسے منحوس کہہ کر بھگا دیتا۔

اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ خود کو پالتو کتوں جیسا رکھے گا۔ شاید اس طرح اسے کوئی مالک مل جائے اور وہ بھی عزت دار ہو جائے۔

وہ ایک شام کو باغ میں پہنچا جہاں اکثر دو تین پالتو کتے اپنے مالکوں کے ساتھ گھومنے آتے تھے۔

وہ جھاڑیوں کی اوٹ سے انھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ہوا کا ایک آوارہ جھونکا اس کی طرف سے ہو کر باغ کی طرف گیا۔ بس پالتو کتوں نے ان جھاڑیوں کی طرف چھلانگیں لگا دیں۔ وہ بھونک بھی رہے تھے۔

آج اسے اپنی بہادری دکھانے کا اچھا موقع ملا تھا۔ اس نے بھی بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ باغ میں کھیلنے والے دو تین لڑکے بھی دوڑ کر جھاڑیوں کی طرف آ گئے۔

پالتو کتوں نے صرف بھونکنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ اس کی جانب لپکے، یہ حملہ دونوں طرف سے ہوا تھا۔ اس نے بھی بڑی پھرتی کے ساتھ پہلے ایک پھر دوسری طرف مقابلہ کیا۔ اسے کافی مشکل ہو رہی تھی مگر پھر بھی وہ ان تینوں کتوں سے نمٹ سکتا تھا۔

''سفید والا بھی کم نہیں ہے۔'' اس نے ایک تماشائی کی آواز سنی۔ اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔ اس نے چھوٹے کالے کتے کو جا کر گردن سے دبوچ لیا جو تکلیف سے چیختا ہوا بھاگ گیا۔ اتنے میں بڑے لال کتے نے اس کی بغل میں کاٹ ڈالا۔ اس وقت تک اس نے سیدھا ہو کر لال کتے کے کان میں دانت گاڑ دیے۔ اس نے اپنے دانت لال کتے کے کان سے نکال کر تیسرے کتے کو للکارا۔ تیسرا کتا دو تین قدم دوڑ کر پھر اس کی طرف گھورتے ہوئے بھونکنے لگا۔

قاعدے کے مطابق وہ یہ مقابلہ جیت چکا تھا۔ سو وہ سینہ تان کر کھڑا رہا۔ اسے یقین تھا کہ یہ تینوں کتے آئندہ کبھی اس پر حملہ نہ کریں گے۔ وہ ذرا ہوشیاری اور اعتماد کے ساتھ تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہوا باغ سے باہر چلا گیا۔

جو لوگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے، وہ بھی واپس اپنی اپنی راہ کو ہو لیے۔

اس واقعے کے بعد اس کا اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ وہ خان بہادر صاحب کی حویلی کی طرف جا نکلا۔ وہاں اس نے عجیب شور شرابا اور بھاگ دوڑ دیکھی۔ ہر کتے کو آدمی پیٹھ سے پکڑے کھڑے تھے۔ کتے ہانپ رہے تھے۔ کافی جوش میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے مناسب سمجھا کہ دور رہ کر دیکھتا رہے۔ اسے باغ والی لڑائی ابھی بھولی نہ تھی۔

وہ لوگ کتوں کو بگھیوں میں بٹھا کر روانہ ہو گئے۔ وہ بھی کسی سوچ میں غلطاں، کتوں کی اس پذیرائی پر حیران ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مستقبل میں اس کی بھی ایسی ہی عزت افزائی ہوگی۔ تصور میں وہ خود کو بگھی پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اس کے گلے میں خوب صورت پٹا چمک رہا تھا۔

وہ شہر سے باہر کی طرف جانے والے راستے پر چلنے لگے۔

شہر کے باہر بڑی ہلچل تھی۔ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ اس نے سوچا، شاید کوئی بڑا جھگڑا ہو گیا ہے۔

مگر نہیں یہ لوگ تو بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔

یہاں ایک بڑے گروہ میں اسے خان بہادر صاحب بھی دکھائی دیے۔

اُس کی خان بہادر صاحب کو اپنا آپ دکھانے کی خواہش دائرے کے اندر لے گئی۔ مگر وہاں اس جیسے آوارہ کتوں کی کیا اوقات تھی۔ بڑے بڑے کتے پٹوں اور زنجیروں کے ساتھ دائرے کے درمیان بیٹھے تھے۔

وہ بھی ایک ایسی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا جہاں اسے کسی شیخی خور کی لٹھ پڑنے کا ڈر نہ تھا۔

مجمع بڑھنے لگا۔ اس دوران وہ بہت پریشان ہو گیا۔ اسے اک عجیب اور ناگوار بو نے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ گردن اٹھا کر بھونکنا چاہتا تھا مگر فوراً اس کی یہ خواہش کسی ڈنڈے کی مار اور بے عزت ہو کر مجمعے سے نکالے جانے کے خوف تلے دب گئی۔

مگر اس کی یہ پریشانی پھر سر اٹھانے لگی۔ وہ عجیب اور ناگوار بو اب بڑھتی جا رہی تھی۔

اتنے میں اک عجیب جانور اک لٹھ بردار آدمی کے ساتھ مجمعے میں داخل ہوا۔

وہ فوراً اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جا کر اس جانور کے منہ پر کاٹ لے مگر اس نے انتہائی خواہش کے باوجود خود کو قابو میں رکھا۔ وہ بڑے صبر کے ساتھ اک کونے میں خاموش کھڑا رہا۔

کافی شور اور ہنگامے کے بعد سب لوگ کھسک کر دائرے میں بیٹھ گئے۔ درمیان میں صرف وہ عجیب جانور کھونٹے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ سارا میدان خالی ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے اندر عجیب سا جوش محسوس کیا۔ وہ اک جھٹکے کے ساتھ تن کر کھڑا ہو گیا۔ شاید اس وقت خود کو روکنا اس کے بس میں نہ تھا۔ شدید غصے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے دھندلے پن میں دیکھا کہ تین پالتو کتے اس جانور پر حملہ کر چکے تھے۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے دیکھا کہ ایک کتا عجیب دردناک آواز نکالتا ہوا تڑپ رہا تھا۔ اس کی انتڑیاں باہر لٹک رہی تھیں۔

پھر اس نے دوسری دردناک چیخ سنی، خان بہادر صاحب والا بڑا کتا اس کراہت

بھرے جانور کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔

اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ تیسرے کتے کا بھیانک انجام دیکھنے کے لیے اس نے اپنی آنکھیں اوپر نہ اٹھائیں بلکہ اس عجیب جانور کے لیے اس کی بڑھتی ہوئی نفرت نے بڑا حوصلہ دیا تھا۔ وہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھا اور اپنے نوکیلے دانت مکروہ جانور کی گردن میں گاڑ دیے۔ اسے پہلی بار اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ جانور تکلیف سے چاروں طرف چکر کاٹنے لگا۔ اس نے اپنے دانت جانور کی گردن سے نکال کر اس کی بغل میں گاڑ دیے۔

اس نے لوگوں کا بڑھتا ہوا شور سنا۔ وہ واہ وا کر رہے تھے۔ مگر اسے آج وہ خوشی محسوس نہ ہوئی جو باغ میں کتوں کے ساتھ لڑ کر ہوئی تھی بلکہ اسے بہت زیادہ چڑچڑاہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے آج لوگوں کو صحیح رنگ میں دیکھا تھا۔ اچھا! یہ اسی لیے کتوں کو اچھی خوراک کھلاتے تھے۔ اس نے سوچا۔

اتنے میں اس کی نظر لاٹھی والے آدمی پر پڑی جو کہ سخت پریشان تھا اور اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر اس کی ہمت بڑھ گئی۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ اس عجیب جانور پر حملہ کر دیا۔ اس کا یہ حملہ خطرناک ثابت ہوا اور دوسرا کتا بھی تیزی کے ساتھ حملے کرنے لگا۔ اب تو عجیب جانور بلند آواز میں چیخ رہا تھا۔ اس کے تصور میں مکروہ جانور کی بے بسی اک نئی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی بدبو اور بدنما شکل کھو چکا تھا۔ اب اس کے خدوخال جانے پہچانے لگے۔ وہ بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا۔ اس کے منہ میں عجیب ذائقہ اسے اک نئی توانائی دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے بڑے جوش کے ساتھ چھلانگ لگا کر جانور کی گردن میں اپنے دانت گاڑ دیے۔ اس کا منہ گرم اور گاڑھے مائع سے بھر گیا۔ اسے حیرت انگیز راحت کا احساس ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ خان بہادر کا لہو پی رہا ہو۔

بے رُت موسم

اس نے مہتا اینڈ کمپنی کا دفتر بند کر کے چابی اپنی پتلون کی جیب میں ڈالی۔ کمپنی کے حساب کتاب کی سالانہ جانچ پڑتال کی وجہ سے اسے دیر تک آفس میں بیٹھنا پڑا تھا۔ دو چار دفعہ گھڑیال کی آواز نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے وال کلاک کی سوئیاں دیکھ کر نگاہیں دوبارہ رجسٹر پر مرکوز کر دیں۔

اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا۔ صرف چائے پر گزارا کرتا رہا۔ جب چھ بجے تو اس نے بڑا رجسٹر بند کیا اور اٹھ کر دفتر کی کھڑکیاں دروازے بند کیے۔ بلڈنگ سے نکلتے وقت اس کے ذہن میں کھانے کا خیال موجود رہا، لیکن اس نے کندھے جھٹک کر اس خیال کو نظرانداز کیا تو اس کے ذہن میں دفتر کا وال کلاک آ گیا تھا جس کی گھنٹے والی سوئی چھ کے ہندسے پر تھی۔ اب تو اس نے رات کا کھانا کھانا تھا۔ ویسے بھی اس جیسے تنہا فرد کی زندگی میں کھانے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ اگر کھا لیا تو ٹھیک اور اگر نہ کھایا تو بھی ٹھیک۔

پچپن سالہ سہراب کا قد لانبا اور جسم اکہرا تھا۔ تنے بدن پر جین کی سفید پینٹ اور سفید کھدر کی بشرٹ اسے جچ رہی تھی۔ وہ بے دھیانی میں ست قدم لیتا ہوا چلتا رہا۔ سامنے فٹ پاتھ پر بڑا رش تھا، اس نے چال دھیمی کی اور فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک پر چلنے لگا۔ بینک میں بل جمع کرانے والوں کا ہجوم تھا۔

طویل قطار—

اس نے سڑک پار کی اور گردن گھما کر لوگوں پر نظر ڈالی۔ تھکے ہوئے چہرے، جن پر بیزاری کی جھلک بھی موجود تھی۔ اسے طویل قطار میں سارے چہرے ایک سے دکھائی دیے۔ وہ سب چہروں پر نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ قطار کا آخری چہرہ اسے قطعی مختلف لگا... اس چہرے پر بیزاری کے بجائے کچھ اور تحریر تھا، کوئی ایسی بات جسے وہ پوری طرح پڑھ نہیں سکا تھا۔ اس کے پیر ٹھٹکے۔ یہ کون سا جذبہ تھا جو اس چہرے پر اس قدر نمایاں تھا؟

پچاس سالہ عورت جس نے سوتی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ تھی تو وہ بھی قطار کا حصہ لیکن سب سے جدا معلوم ہوتی تھی۔ اس کے پیر فٹ پاتھ کے فرش پر جم گئے۔ ذہن میں ایک بھونچال آ گیا۔ وقت کی پرتیں افراتفری میں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے لگیں۔ تیس سال قبل جب وہ مہتا اینڈ کمپنی میں کلرک بھرتی ہوا تھا، اس وقت جوانی اس کی رگوں میں لہو کے ساتھ گردش کرتے ہوئے جس سرمستی کا احساس دلاتی تھی، وہ اسے کئی تفکرات سے آزاد کر دیتی تھی۔ زندگی کے متعلق اس کے سہانے خواب دنیاوی حقائق سے میل نہیں کھاتے تھے، لیکن اسے ان باتوں کی چنداں پروا نہیں ہوا کرتی تھی۔

وہ رتی بائی کو چاہتا تھا۔ اکثر شام کے وقت جہانگیر پارک کے بنچ پر بیٹھ کر ان دونوں نے مل کر اپنے گھر کا نقشہ بنایا تھا اور گھر کے ذکر پر رتی بائی کی من موہنی مسکراہٹ اسے مدہوش کر دیتی تھی۔

ان کے باپ جمشید سے اس کی نہیں بنتی تھی۔ جمشید کی عزیزوں میں کسی سے بھی نہیں بنتی تھی۔ ہمیشہ کسی نہ کسی بات پر لڑتے جھگڑتے رہنے کی وجہ سے جماعت کے اکابرین اسے تنبیہ کرتے رہتے تھے مگر جمشید پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا۔

شراب کے نشے میں کئی دفعہ جمشید نے رتی کو اس سے ملنے کی وجہ سے مارا پیٹا بھی تھا۔ سہراب کو اس بات پر سخت طیش آتا تھا۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکتا اور اکثر رتی کے روبرو اس کے باپ کے متعلق سخت الفاظ استعمال کرتا رہتا۔ جس پر رتی اس سے خفا ہو جاتی تھی، لیکن وہ بعد میں رتی سے معذرت کر کے اسے منا لیتا تھا۔

جمشید کے لیے شراب نوشی تو گویا فرض تھی۔ شاید ہی کوئی دن گزرا ہو جب اس

نے شراب نہ پی ہو اور بدمست نہ ہوا ہو۔ اس کی بدمستیوں کا رفیق ہرمز تھا۔ دونوں لالہ رام داس کے شراب خانے پر اکٹھے آتے جاتے تھے۔ یہ ہرمز کے طعنوں کا ہی نتیجہ تھا کہ جمشید رتی کو سہراب سے ملنے پر مار پیٹ کرتا تھا۔ ان دونوں کے یارانے کا نتیجہ برآمد ہوا کہ اب جمشید رتی کو ہرمز کے ساتھ بیاہنا چاہتا تھا۔ آخر ایک بدنصیب دن جمشید نے اپنی برادری میں رتی کی شادی کا اعلان کر ڈالا۔ رتی پر تو جیسے دیوار آگری ہو، اس نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا تھا۔ رتی کی والدہ خاموش رہی، کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ گویا سب راضی تھے۔

سہراب نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس بات کے تصور نے اس کے خون کی گردش تیز کردی تھی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے کس طرح اپنے غصّے پر قابو پایا تھا اور رتی کو تسلی دی کہ اس کی زندگی میں رتی کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ رتی نے خاموشی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں موجود سوالوں کے ساتھ ساتھ ایک ان دیکھا خوف بھی شامل تھا۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرح جمشید کو اس کی ضد سے باز رکھے گا۔ بہرحال اسے یہ یقین تھا کہ رتی کسی بھی قیمت پر ہرمز کی نہ ہوسکے گی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ حالات کسی ناگہانی مصیبت کی طرف جاسکتے تھے، لیکن آخر اس سے بڑھ کر دوسری کیا مصیبت ہوسکتی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوجائیں، جب رتی کا چہرہ ذہن میں آتا تو جسم میں سرسراہٹ دوڑ جاتی۔ اسے اس شام کی ہر ایک گھڑی اور اس کی ہر تفصیل یاد تھی۔ وہ جمشید سے بات کرنے کے لیے لالہ رام داس کے شراب خانے پر گیا تھا اور اسی شام...

اس شام نے تو سب کچھ بدل ڈالا، اس کی زندگی بدل ڈالی۔ زندگی جو وعدوں اور امیدوں سے بھری ہوئی تھی۔ یک دم جیل کی تاریکیوں اور مایوسیوں میں تبدیل ہوگئی۔ کہاں وہ اور رتی اپنے گھر کے سپنے دیکھتے تھے اور کہاں وہ تنہا بے قرار جیل کی کالی رات میں نیند کے لیے ترستا رہا۔ جیل کے یہ پچیس برس انتظار کے طویل سال تھے۔ ایسا انتظار جس کی کوئی منزل ہوسکتی تھی کیا؟

''سہراب جی؟''

''ہاں— آ! کون؟'' وہ اپنے تاریک ماضی سے نکل آیا۔ اس کے سامنے واقع سڑک کے فٹ پاتھ پر قطار ختم ہوگئی تھی اور قطار کے آخر میں کھڑی عورت بھی اب فٹ پاتھ پر نہ تھی۔

''سہراب جی!''

اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ عورت تو اس کے قریب کھڑی تھی۔ دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ جسم کا سارا لہو دماغ میں دوڑتا محسوس ہوا۔ جوش اور شوق لہو کے قطرے قطرے میں شامل ہوکر آنکھوں میں جگہ بنانے لگے۔

''کیسی ہو رتی؟'' اس نے حوصلہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کیسے ہیں؟'' فکرمندی میں ڈوبی عورت نے اپنائیت کے ساتھ پوچھا۔ یہ اپنا کیا حال کر رکھا ہے؟''

''آج کل آفس میں کام زیادہ ہے نا، اس لیے!'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے عجلب میں سوال کیا، ''تم کیسی ہو رتی؟ کم زور ہوگئی ہو۔''

''میں تو ٹھیک ہوں سہراب جی! آپ نے صدمات کا بوجھ اٹھایا ہے۔ اپنا خیال رکھا کریں۔'' رتی نے کھانستے ہوئے کہا۔

''رتی تم ٹھیک تو ہو؟''

''نہیں نہیں میں— میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''مجھ سے مت چھپاؤ رتی، تم— تم ٹھیک نہیں ہو۔'' اس کی زبان نے بڑی مشکل سے دکھ میں ڈوبے الفاظ ادا کیے۔

''بس چند دنوں سے معمولی کھانسی ہے، ٹھیک ہوجائے گی۔ آپ ہرگز فکرمند نہ ہوں۔'' رتی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا، اس کی آنکھوں میں پانی کی تہ دکھائی دی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔

وہ بہت کچھ بتانا چاہتے تھے۔

لیکن وہ خاموش تھے۔

ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہم درد بھی نہیں بانٹ سکتے؟'' سہراب دل کو مضبوط کرتے ہوئے بڑی مسرت کے ساتھ محض اتنا ہی کہہ سکا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''آخر ایک عورت اپنے باپ اور ہونے والے شوہر کے قاتل کے ساتھ کس طرح رہ سکتی ہے۔'' رتی نے عجیب لہجے میں کہا۔

''بے شک یہ آواز جانی پہچانی تھی— لیکن یہ آواز رتی کی تو نہیں تھی۔ سہراب نے رتی کی آنکھوں میں دیکھا، اس کے چہرے پر وہی تاثر تھا جو اس نے قطار میں کھڑی عورت کے چہرے پر دیکھا تھا۔

شاید یہ انتظار کا تاثر تھا— ایسا انتظار جس کی کوئی منزل نہ ہو۔

روتا ہوا پھول

میں بہت خوش ہوں۔ بابا سائیں مجھے اپنے ساتھ گاؤں لے کر جانے کا وعدہ پورا کر رہے ہیں۔ آخرکار امی جان نے بھی اجازت دے ہی دی۔ بابا سائیں بہت اچھے ہیں، امی جان بھی مجھے بہت پیار کرتی ہیں لیکن کبھی کبھار پٹائی بھی کرتی ہیں۔

میں نے ابھی تک گاؤں نہیں دیکھا۔ ہمیشہ امی جان کے ہمراہ شہر میں رہا ہوں۔ بابا سائیں بھی شہر میں رہتے ہیں لیکن وہ گاؤں بھی جاتے رہتے ہیں۔ میں اصرار کرتا ہوں تو بابا سائیں وعدہ کرتے ہیں کہ تم بڑے ہوجاؤ تو پھر تمھیں گاؤں لے جاؤں گا۔ اب میں بڑا ہو چکا ہوں۔ ہیڈ مسٹریس نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔ امی جان پھر کہتی ہیں کہ نو برس کا انسان بچہ ہی ہوتا ہے۔ جو انسان ملازمت کرتا ہے، وہ بڑا ہوتا ہے۔ بابا سائیں میری طرف داری کرتے ہیں۔ انھیں سب پتا ہے کہ انسان کتنے سال کا ہوجائے تو وہ بڑا ہوجاتا ہے۔ امی جان تو صرف اس لیے کہتی ہیں کہ میں گاؤں نہ جاؤں۔ بابا سائیں، امی جان کو گاؤں نہیں لے جاتے۔ امی جان کو تنہائی میں ڈر لگتا ہے۔ ڈر تو رات کو مجھے بھی لگتا ہے، جب لائٹ آف ہوجاتی ہے۔ ڈر تو سب کو لگتا ہے۔

بابا سائیں گاڑی چلا رہے ہیں اور میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہوں۔ سامنے دیکھنے کے لیے میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ بابا سائیں میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ جانے کیوں؟— بابا سائیں کم بولتے ہیں، امی جان کو بہت

باتیں یاد ہیں۔ وہی تو رات کو کہانیاں بھی سناتی ہیں۔ بابا سائیں کہہ رہے ہیں، ''حسین بڑا ہو چکا، آج میں خوش ہوں۔'' بابا سائیں درست کہتے ہیں۔ میں بھی بہت خوش ہوں۔

ہمارا گاؤں بہت دور ہے۔ بابا سائیں کہتے ہیں، ''حسین تم تھک تو نہیں جاؤ گے؟''

میں ان سے کہتا ہوں، ''بابا سائیں گاؤں جانے والے کبھی تھکتے نہیں۔''

''وہ میری بات تسلیم کرتے ہیں کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ اگر گاؤں جانے والے تھکتے ہوتے تو پھر بابا سائیں کیوں بار بار گاؤں جاتے؟

ہم صبح سویرے جاگ گئے تھے۔ ابھی تاریکی تھی، جب ہم روانہ ہوئے۔ بابا سائیں کہتے ہیں کہ گاؤں جلد پہنچیں گے۔ میں بھی گاؤں جلد پہنچنا چاہتا ہوں۔ گاؤں میں بیریاں ہیں، وہاں ڈھیروں بیر ہیں۔ مجھے بیر بہت پسند ہیں۔ بابا سائیں بتاتے ہیں کہ گاؤں کے بیر بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں نے ابھی تک یہ بیر نہیں کھائے۔ میں تو اب گاؤں جا رہا ہوں، امی جان تو کبھی گاؤں نہیں گئیں حالاں کہ وہ تو بڑی ہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں وہ اب تک گاؤں نہیں گئیں؟ بابا سائیں اکیلے ہی جاتے ہیں۔ اب میں بھی جا رہا ہوں، میں تو بڑا ہو چکا ہوں۔

بابا سائیں کو گاؤں بہت اچھا لگتا ہے، تبھی تو وہ بار بار گاؤں جاتے ہیں۔ راستے میں بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔ میں بابا سائیں سے پوچھتا ہوں۔ بابا سائیں یہ پہاڑ کیسے بنے ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ جب زمین بنی تو یہ پہاڑ بھی بن گئے۔

میں نے بابا سائیں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ ساری چیزوں کا خالق ہے، یہ ہماری کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ میں نے بابا سائیں سے پوچھا، کیا پہاڑ اللہ میاں سے بڑے ہیں؟ بابا سائیں نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا، ''پتا نہیں، میں نہیں جانتا۔'' مجھے علم ہے، اللہ میاں سب سے بڑے ہیں۔ امی جان کو سب پتا ہے، وہ مجھے پڑھاتی ہیں۔ بابا سائیں یہ باتیں نہیں جانتے، وہ ایسی کتابیں نہیں پڑھتے ہیں۔

بابا سائیں گاڑی آہستہ چلا رہے ہیں۔ اگر میں ہوتا تو گاڑی اتنی تیز چلاتا، اتنی تیز چلاتا کہ منٹوں میں گاؤں پہنچ جاتا۔ اگر میرے پاؤں نیچے ریس تک پہنچتے۔ بابا سائیں

کہہ رہے ہیں کہ دل تو چاہتا ہے چار منٹوں میں گاؤں پہنچ جاؤں... آج تو تم بھی جا رہے ہو اپنے گاؤں— لیکن بیٹا روڈ پر دوسری گاڑیاں بھی تو ہیں۔

روڈ پر بڑے بڑے ٹرک چلتے ہیں۔ یہ بہت تیز رفتار ہوتے ہیں اور سب سے بڑے بھی۔ میں نے بابا سائیں سے پوچھا، ''یہ سب سے بڑے ہوتے ہیں؟'' بابا سائیں نے کہا، ''یہاں تو یہی سب سے بڑے ہیں۔'' ہماری سوزوکی سے بھی بہت بڑے ہیں۔ ہماری سوزوکی ان سے اچھی ہے۔ مائیکل کی کار سب سے اچھی ہے۔ یہ سب سے تیز چلتی ہے۔ بابا سائیں بتاتے ہیں کہ وہ تیز رفتار کار یہاں نہیں چل سکتی۔ وہ انگلینڈ میں ہی چلے گی— یہاں بھی چل سکتی ہے اگر یہ بے ڈھب ٹرک نہ ہوں تو۔

امی جان ہمارے ساتھ گاؤں چل تو سکتی تھیں۔ بابا سائیں نے میری طرف دیکھا۔ عجلت میں بولے، ''بابا سائیں اور دوسرے گھر والے تمھیں دیکھ کر ضرور خوش ہوں گے۔ پھر تمھاری امی کو بھی گاؤں لے کر آئیں گے۔'' میں بہت خوش ہوا۔ بابا سائیں نے کہا، ''حسین تم تالیاں بجا رہے ہو! تمھاری امی ضرور گاؤں آئیں گی، پھر چاہے کچھ بھی ہو جائے، ہم سب میٹھے بیر کھائیں گے۔''

اچانک سڑک پر کھڑے مردوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ بابا سائیں نے گاڑی کو بریک لگائی۔ بابا سائیں کے سینے سے خون بہہ نکلا۔ میرا تو دل ہی رک گیا، گاڑی روک کر بابا سائیں نیچے اترے۔

''مار رہے ہو یا لوٹ رہے ہو؟'' بابا سائیں نے پوچھا۔

''گولیوں سے ہی ڈرتے ہو، ویسے پیسے کب دیتے ہو،'' آدمی نے زور سے کہا۔

بابا سائیں سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکے اور پھر زمین پر گر گئے۔ آدمی نے مجھے کھینچ کر گاڑی سے باہر نکالا۔

''وارث تو مر گیا، اب اس کا تاوان کون دے گا۔ چھوڑ دو مصیبت کو۔'' ایک داڑھی والے آدمی نے کہا۔ وہ سب گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ گئے۔ میں دوڑ کر بابا سائیں کے پاس گیا— اور بابا سائیں کو کھڑا کرنے کی کوشش کی۔''

وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی بڑی، سیاہ اور شفاف آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ اس نے اٹکتے اٹکتے پوچھا، ''ڈاکٹر انکل! نرس کہتی ہے کہ سہراب کے ابو کی طرح میرے بابا، سائیں بھی مر گئے ہیں، جواب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے؟''

رنجیدہ معصوم بچے کی آنکھوں سے نکلتے آنسو اس کے سرخ گالوں پر بہنے لگے۔ میں نے انتہائی دکھ کی لہر محسوس کی۔ اس رنج کو خود پر حاوی ہونے سے روکنے کی کوشش کی لیکن خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

دل اچھل کر رہ گیا۔ بے اختیار آنکھوں سے اشک بہہ نکلے۔ اس معصوم کو بانہوں میں بھر کر میں خود بھی دانت بھینچ کر رونے لگا۔

سچائی

''...رائٹ اسٹریٹ...لیفٹ ہک...رائٹ انڈر کٹ...لیفٹ اسٹریٹ...رائٹ اسٹریٹ... بہت خوب، اسپیڈ اب ٹھیک ہے۔ کچھ وقت پنچنگ بیگ پر اپنی توجہ کے ساتھ پریکٹس کرو، میں آکر اسپائرنگ کراتا ہوں...!'' کوچ نے لمبی سانس لیتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

نوجوان لڑکے نے اپنی بانہوں سے آنکھوں پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے پنچنگ بیگ پر مُکا بازی شروع کردی۔ اس کی عمر قریباً چودہ پندرہ برس ہوگی۔ قد قدرے لانبا، بدن ذرا سا دُبلا چکیلا اور پٹھے مضبوط تھے۔ کمر کے اوپر کے حصے کو خم دے کر وہ بائیں مکے کے ساتھ، اوپر کے دھڑ کو آگے لاتے ہوئے پوری قوت سے پنچنگ بیگ کو مُکا مار کر، اسی سانس میں دائیں کندھے کو جھکا کر جسم کو پھرتی سے واپس لاتے ہوئے گھونسے برسا رہا تھا۔ اس کی حرکت میں توازن اور مکے کی قوت کا اندازہ بھاری پنچنگ بیگ پر پڑنے والی چوٹ کے بعد اُس کے ہلنے سے کیا جاسکتا تھا۔

یہ پنچنگ بیگ ہال کے جنوب مغربی کونے والی دیوار کے ساتھ تھا، جو مُکا پڑنے پر دیوار سے ٹکرا کر جلد ہی واپس اپنی صحیح جگہ پر لوٹ آتا تھا۔

لڑکے کے گھونسوں میں تیزی آتی گئی۔ وہ ناک سے سانس چھوڑتے وقت ہلکی سی آواز بھی کر رہا تھا۔ اس کے بال چھوٹے گھونگھریالے تھے جو اس قدر مشقت کے

باوجود پیشانی پہ نہیں آ رہے تھے۔

وہ اک لمحے کو رُکا، اس کا چھوٹا سا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا، اس نے اپنے دستانے کمر پر رکھتے ہوئے زور سے گہرا سانس لیا اور دوبارہ پنچنگ شروع کردی۔

کوچ، جس کی عمر قریباً تیس برس ہوگی، درمیانی قامت کا تھا۔ اس کا جسم مضبوط اور کسرتی تھا جو قد کی مناسبت سے بھلا لگتا تھا۔ اگرچہ وہ خوب صورت نہیں تھا پھر بھی بلاشبہ وہ پُرکشش چہرہ رکھتا تھا۔ ماتھے پہ موجود دو عمودی لکیریں اسے حد درجے کی سنجیدگی بخش رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا اپنی خوش دلی جلدی ظاہر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ہال میں تقریباً پندرہ نوجوان لڑکے مختلف مشقوں میں مصروف تھے۔ ہال کے ساتھ ایک رِنگ بنا ہوا تھا۔ چھ پنچنگ بیگ چھت کے گارڈروں کے ساتھ مختلف جگہوں پر لٹک رہے تھے۔ رِنگ کے ساتھ ایک پنچنگ بال بھی لگا ہوا تھا۔ اس سے ذرا پرے اسٹول پر جگ اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کی دو بنچیں پڑی تھیں۔

رِنگ میں دو لڑکے اسپائرنگ کر رہے تھے۔ کوچ انھیں ہدایات دے کر گھونگھریالے بالوں والے لڑکے کے پاس آیا جو نہایت انہماک کے ساتھ پنچنگ کر رہا تھا۔ لڑکے نے جب کوچ کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو اس کے مُکوں کی رفتار تیز ہوگئی اور اس کی سانس لینے کی آواز بھی تیز ہوگئی۔

''... پیروں کا درست استعمال ضروری ہے... جب بیگ واپس پلٹتا ہے تو پچھلے پیر کو تھوڑا سا پیچھے کھسکاؤ اور ساتھ ساتھ بائیں پاؤں کو بھی ذرا سا پیچھے لاؤ اور...'' کوچ اسے روک کر سمجھانے لگا۔ اس نے لڑکے کی آنکھوں میں دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ اس کی بات سمجھ گیا ہے۔ ''دوسرا یہ کہ واپس آتے ہوئے بیگ کو ٹائمنگ کے ساتھ پنچ مارو— پنچ میں کندھے کی طاقت بھی لگاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے بیگ پر لیفٹ اسٹریٹ اور رائٹ اسٹریٹ پنچ مار کر دکھائے۔

اسٹاف کی آواز میں سختی تھی، نہ ہی چہرے پہ کوئی تاثر۔ لڑکے نے عجیب نظروں

سے کوچ کو دیکھا اور گردن کے اشارے سے اس کو دی گئی ہدایات پر عمل کرنے کا کہا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ کوچ منہ موڑ کر ڈوری کودتے لڑکوں کی طرف بڑھ گیا۔ ہر روز شام چار بجے پریکٹس شروع ہوتی تھی۔ کوچ کالج میں طلبہ کو ٹریننگ دینے کے لیے منگوایا گیا تھا۔ اس کی سروس نیوی میں تھی اور وہ چھ ماہ کے لیے ڈیپورٹ ہوکر آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ چھ ماہ پورے کرکے کراچی لوٹ جائے گا۔ جہاں اک مکرانی☆ کے ساتھ بزنس کرے گا۔ مکرانی کو مچھلی کے دھندے میں کافی منافع ہوا تھا۔ ان دونوں کا ارادہ پلاسٹک کا کاروبار کرنے کا تھا۔ اسٹاف کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں اس کی طرف سے تاخیر کی وجہ سے مکرانی کسی دوسرے سے شراکت نہ کرلے۔ ایسا موقع اسے دوبارہ کب ملنا تھا۔

اسے یہاں بیس روز گزر چکے تھے۔ تمام لڑکوں سے اس کی شناسائی تعارف تک محدود تھی۔ شام کو قریباً پندرہ لڑکے ٹریننگ کرتے تھے۔ صبح کی شفٹ میں بارہ افراد تھے جن میں دو پی ٹی کے استاد بھی شامل تھے۔ شام کی شفٹ والے زیادہ تر بچے آٹھویں یا نویں کلاس کے طلبہ تھے۔

اس وقت تک وہ تمام لڑکوں کے ناموں سے واقف ہوچکا تھا۔ گھونگھریالے بالوں والے لڑکے کا نام محمود تھا۔ جس کے بابت اسے کسی حد تک یقین ہو رہا تھا کہ وہ باکسنگ کے کھیل میں بہت آگے جاسکتا تھا۔ محمود کھیل میں دل چسپی لے رہا تھا اور اس نے کسی بھی مشق میں تردّد نہیں کیا تھا بلکہ توجہ اور شوق کے ساتھ سخت ترین ایکسر سائزیں کرنے کی بھی پوری کوشش کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تین ہفتوں کے دوران کافی حد تک اسٹائل پر قادر ہوچکا تھا۔ البتہ ابھی اس کا فُٹ ورک تسلی بخش نہیں تھا۔

''میں اس پر زیادہ محنت کروں گا،'' اس نے سوچا۔ وہ محمود کی طرف بڑھ گیا اور اسے سمجھانے لگا۔ اس کی آواز بھاری تھی مگر وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ آہستہ بولے۔ وہ محمود کو لے کر رِنگ کی جانب گیا۔ ایک اور لڑکے کو بُلا کر، دونوں کو اسپائرنگ کرنے کو کہا... دونوں لڑکے کوچ کے ہمراہ رِنگ میں داخل ہوئے۔ کوچ نے اشارہ کرتے ہوئے ''باکس''

☆ مکرانی: سندھ اور بلوچستان میں آباد ایک بلوچ قوم۔ جس کو مکران کی نسبت سے مکرانی بلوچ کہا جاتا ہے۔

کہا۔ لڑکے کچھ شرم اور کچھ اک دوسرے کے لحاظ سے مکے آہستہ آہستہ مارنے لگے۔

''اسٹاپ!'' کوچ نے انھیں روکا اور کہا، ''تیزی کے ساتھ مکے مارو مگر چہرے پر مُکا نہیں مارنا ہے۔''

لڑکے تیز ہوگئے۔ اس نے اطمینان کے ساتھ گردن اثبات میں ہلائی۔ محمود کے بازوؤں کی تیزی اور طاقت ور مکوں کی وجہ سے دوسرا لڑکا اس کے قریب آنہیں پا رہا تھا۔ محمود کھڑا ہوا کھیل رہا تھا۔ دوسرا لڑکا پیٹ پر ایک زوردار مُکا پڑنے کی وجہ سے جذباتی ہوگیا۔ اس نے محمود کے چہرے پر مُکا مارا۔ کوچ کی آنکھوں میں بے چینی عود کر آئی۔ محمود نے چہرہ جھکا کر اپنے سر سے اس کے کندھے پہ قوت صرف کرتے ہوئے اس کے پیٹ پر لیفٹ، رائٹ، لیفٹ جاب مار کر اُسے رِنگ کے کونے کی طرف دھکیل دیا۔ کوچ نے جب دیکھا کہ محمود جذباتی نہیں ہوا تھا اور اس نے مقابل کے صرف پیٹ اور سینے پر مکے مارے تھے اور اس کا لحاظ بھی کر رہا تھا تو کوچ کے چہرے پر اک ہلکی مسکراہٹ آئی لیکن پھر اس کی روایتی سنجیدگی غالب آگئی۔

''اسٹاپ!'' کوچ نے اشارے سے کھیل ختم کرنے کو کہا۔ دونوں لڑکے اس کی طرف چلے آئے۔ اس نے انھیں شاباش دی اور محمود کو اک جگہ کھڑے رہ کر کھیلنے سے منع کرتے ہوئے سمجھانے لگا، ''بائیں سمت سے آگے بڑھا کرو، اک جگہ رُک کیوں جاتے ہو؟ مکے مارتے ہوئے بایاں پاؤں ذرا آگے اور ذرا بائیں طرف کھسکاتے ہوئے اس کے پیچھے دایاں پاؤں لاتے ہوئے چلا کرو۔ واپسی کے لیے دائیں پیر کو پیچھے اور تھوڑا سا دائیں جانب سرکاتے ہوئے، بایاں پیر اس کے پیچھے لایا کرو— سمجھے؟'' اس نے محمود کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

محمود گردن سے ہاں کا اشارہ کرکے اپنے دستانوں کی طرف دیکھنے لگا۔

اس بات کو ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا۔

اس دوران محمود انتہائی شوق کے ساتھ پیروں کا استعمال سیکھتا رہا۔ اب وہ آرام سے گھونسے مارتا ہوا دائیں یا بائیں سمت چکر لگا لیتا تھا اور اسی چکر میں واپس بھی آسکتا

تھا۔ لیکن ابھی زیادہ تیزی نہیں آئی تھی۔

کوچ نے محمود پر بھرپور توجہ دی تھی۔ محمود کے شوق نے اس کی محنت آسان کردی تھی۔ کوچ جمنازیم کے قریب اس کمرے میں رہتا تھا جس میں باتھ روم تھا۔ شروع میں وہ باہر کم نکلتا تھا اور محدود لوگوں سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ اسے اسکول کی تمام حدود کا بھی پتا نہیں تھا اور نہ ہی اسکول کے معمولات کے بارے میں کوئی علم تھا۔

محمود نے اسے بتایا تھا کہ وہ جماعت نہم کا طالب علم تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ پریکٹس کے بعد وہ اپنے کمروں میں جاتے تھے اور تیار ہو کر ایک گھنٹا پڑھتے تھے۔ یہ پیریڈ 'پریپ' کہلاتا تھا۔ اس کے بعد وہ رات کا کھانا کھانے میس میں جاتے تھے۔ کھانے کے لیے انھیں ایک گھنٹا چھٹی تھی۔ جس کے بعد دوبارہ واپس اپنے کمروں میں جانا ہوتا تھا۔ دس بجے 'لائٹس آف' یعنی لائٹس آف کرنا لازمی تھا۔ لہٰذا وہ اپنا ہوم ورک جلدی ختم کر کے سو جاتے تھے۔ سنیچر کی شام اور اتوار کا پورا دن چھٹی ہوتی تھی۔

گزشتہ بدھ کو پریکٹس کے بعد اسٹاف اور محمود آپس میں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹہ باتیں کرتے رہے تھے۔ ایک ایک کر کے سارے لڑکے چلے گئے تھے۔ جمنازیم میں صرف ہیلپر رہ گیا تھا جو سامان کو ترتیب سے رکھنے میں مصروف تھا۔ محمود لکڑی کے بنچ پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ کندھے پہ رکھے تولیے سے چہرے کا پسینا پونچھ رہا تھا۔ کوچ اس کے سامنے لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔

محمود نے اس وقت پہلی دفعہ اس کا نام پوچھا۔ ویسے تو لڑکے اسے روایتی طور پر ''اسٹاف'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے مگر کوئی بھی اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اس کا نام مشتاق حسین تھا۔ اسے نیوی میں سروس کرتے ہوئے گیارہ برس ہوگئے تھے۔ وہ نیوی کی باکسنگ ٹیم میں پانچ برس کھیل چکا تھا۔ نیشنل گیمز اور باکسنگ مقابلوں کے متعلق اسٹاف دل چسپ قصے سناتا رہا جو محمود نہایت توجہ اور دل چسپی کے ساتھ بیٹھا سنتا رہا۔

اگرچہ اسٹاف مشتاق انتہائی کم گو تھا مگر اس روز اسے مختلف ٹورنامنٹس کے واقعات یاد آتے رہے اور وہ ان کا ذکر کرتا رہا۔ ابتدا میں اسے ذرا جھجک محسوس ہوئی تھی

لیکن محمود کی دل چسپی کے باعث اس کا اعتماد بڑھ گیا۔

باتوں کے دوران اسے خیال آیا کہ شاید محمود پریپ کے لیے لیٹ ہوگیا ہے۔ وہ یک دم چپ ہوگیا۔ محمود جو اس کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا، اس نے یہ تبدیلی فوراً محسوس کی، ''کیوں اسٹاف! کیا بات ہے؟'' محمود نے پوچھا۔

''آپ کو پریپ کے لیے دیر ہو رہی ہوگی۔'' اسٹاف مشتاق نے کہا۔

''نہیں اسٹاف! آج پریپ تو نہیں ہے، آج بدھ ہے، کھانا آٹھ بجے ہوگا۔ اس وقت میں فری ہوں۔'' محمود نے جواب دیا۔

اس طرح وہ دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔

اسٹاف مشتاق کی کالج میں دل چسپی بڑھنے لگی۔ ایک دن پہلے وہ اکیڈمک ونگ بھی دیکھ آیا تھا، جہاں کلاسیں لگتی تھیں۔ اسے کالج کے گراؤنڈ بہت پسند آئے تھے۔ ہرے بھرے، ہموار، نگاہوں کو کھینچنے کرنے والے۔ کالج کا سیڈل کلب تو اسے بہت زیادہ اچھا لگا تھا۔ وہاں گھوڑے نہایت صحت مند تھے اور انتہائی پیارے لگ رہے تھے۔

کافی انتظار کے بعد آخرکار آج کراچی سے مکرانی کا خط آیا تھا، کوئی خاص بات نہیں تھی۔ خط پڑھتے ہوئے ذہن میں خیال آیا کہ وہ سیڈل کلب جائے گا۔ سفید گھوڑا جس کے ماتھے پر سیاہ نشان تھا، اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کے مضبوط پٹھے اور لانبے بال اسٹاف کے تصور میں لہرانے لگے اور وہ خیالوں میں ڈوبا ہوا مسکرانے لگا۔

سنیچر کا دن تھا۔ آج شام ٹریننگ کی بھی چھٹی تھی۔

وہ بالکل فری تھا۔ اس نے سوچا کہ آج سارا وقت باہر گزارے گا۔

''اگر کہیں شام کو محمود آ گیا...!'' اچانک اس کے ذہن میں خیال پیدا ہوا۔ لیکن پھر اس نے نفی میں گردن ہلا کر اس سوچ کو رد کر دیا۔

وہ سہ پہر کے بعد سیڈل کلب گیا۔ سفید گھوڑے کو دیکھ کر لوٹ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ تیز تیز چل رہا تھا۔

'کوئی خاص کام تو نہیں ہے...' یہ سوچ کر وہ آہستہ چلنے لگا۔ کمرے میں پہنچ کر

اس نے اپنا سامان ترتیب سے رکھنا شروع کر دیا۔ تولیہ تکیے پر پھیلا کر، کپڑے بستر سے اٹھا کر کھونٹی پہ لٹکائے اور کمبل لپیٹ کر پلنگ کی پائینتی کی طرف سلیقے سے رکھا۔ پلنگ کے نیچے سے کالے رنگ کا لوہے کا صندوق اپنی طرف کھینچا اور اس میں سے نیلے رنگ کا بلیزر نکال کر پلنگ پر رکھا۔ اک گرہ لگی نیک ٹائی جس پر نیوی کا مونوگرام تھا، نکال کر پلنگ پر رکھی۔

اسٹاف نے استری گرم کر کے کوٹ کی کریز بنائی، نیک ٹائی کو سیدھا کر کے استری کا پلگ نکال دیا۔ وہ باتھ روم سے غسل کر کے، کپڑے تبدیل کر کے نکلا۔ پھر کوٹ پہن کر ٹیبل کے اوپر لگے آئینے میں خود کو دیکھنے لگا۔ نیلا بلیزر جس پر باکسنگ ٹیم اور نیوی کے اینکر کا نشان تھا، اس کے کسرتی بدن پر سج رہا تھا۔ درمیانہ قد، مضبوط جثہ، آفیسر کٹ مونچھیں، چھوٹے بال...

وہ آئینے میں اپنا آپ دیکھ کر مسکرا دیا، اس کی مسکراہٹ خفیف سی تھی۔

''پانی لے کر آؤ!'' اس نے ہیلپر کو آواز دی۔

ہیلپر کمرے میں آیا تو اسٹاف کو کوٹ میں ملبوس اور کمرے کی ترتیب دیکھ کر حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ غالباً وہ سوچ رہا ہوگا کہ آج یہ اہتمام کیوں؟

مشتاق نے اس کی سوالیہ نظریں دیکھ کر تھوڑی سی بے چینی محسوس کی۔ اس نے جلدی سے کہا، ''آج چھٹی ہے نا— مہمان آئیں گے۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، ''شاید بیگ صاحب آئیں...'' ہیلپر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، ''بیگ صاحب اچھے انسان ہیں نا؟''

جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے دوبارہ کہا، ''پانی لے کر آؤ۔''

ہیلپر اثبات میں گردن ہلا کر باہر چلا گیا۔

اسٹاف مشتاق لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا اور 'اسپورٹس ٹائمز' پڑھنے لگا۔

اسے بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہوگئی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔ اس نے رسالہ میز پر رکھ دیا اور سوچنے لگا۔

'اب کوئی بھی نہیں آئے گا۔'

'ہوسکتا ہے فرصت ملنے پر آئے— اب تو دیر ہوگئی ہے...'

'ہوسکتا ہے کہ محمود شہر گیا ہو...' اک لمحے کے لیے یہ خیال اسے معقول لگا۔

'... یا مہمان آئے ہوں...'

اس نے رسالہ اٹھا کر دوبارہ ورق گردانی شروع کردی۔ گزشتہ ایشین گیمز کے برونز میڈل جیتنے والے اس کے دیرینہ دوست کی تصویر بھی چھپی تھی۔

وہ پھر خیالوں میں کھو گیا۔

''اگر میں بھی زیادہ محنت کرتا تو آج یہاں میری تصویر بھی ہوتی— مگر محمود!... اس کا فوٹو چھپ سکتا ہے— وہ زیادہ محنت کرسکتا ہے— سمجھ دار اور محنتی ہے— میں اسے محنت کراؤں گا— کوئی بات بھی ناممکن نہیں ہے... محمود؟... محمود آج نہیں آئے گا...!

پھر اس کے ذہن میں کوئی خیال آیا۔ وہ جلدی سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ہیلپر کو آواز دیتا ہوا دروازے تک جا پہنچا۔

ہیلپر جمنازیم میں پنچنگ بیگ کی ڈوری باندھ رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا آ گیا۔

''آج تم کھانا مت لانا، میں خود ہی میس میں جا کر کھا لوں گا۔'' اسٹاف مشتاق نے کہا۔

ہیلپر اس خلافِ معمول بات پر حیران رہ گیا اور اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

اسٹاف مشتاق ہیلپر کی حیرانی کی وجہ سمجھ گیا، ''ذرا چکر بھی لگ جائے گا، آج موسم بھی اچھا ہے— نہیں؟'' اس نے کہا۔

ہیلپر گردن ہلاتا ہوا جا کر پنچنگ بیگ کی ڈوری کسنے لگا اور اسٹاف کے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔

اسٹاف نے اپنی کیمی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ''محمود بھی تو اسی وقت کھانا کھانے جاتا ہے نا؟ یا ابھی کچھ وقت ہے؟''

''سائیں آہستہ آہستہ جائیں گے تو وقت سے پہنچ جائیں گے۔ لڑکے بھی اسی وقت آتے ہیں۔'' ہیلپر نے نگاہیں اوپر کر کے جواب دیا۔ پھر وہ اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

اسٹاف چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا جمنازیم سے نکل گیا۔ باہر ہلکی ہلکی ٹھنڈی

ہوا چل رہی تھی۔ موسم سہانا تھا مگر اسٹاف مشتاق موسم سے بے نیاز کسی سوچ میں غلطاں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس کا رُخ بڑے میس کی جانب تھا۔

'قاسم ہال والے بڑے میس میں کھانا کھاتے ہیں۔' اس نے سوچا، 'محمود بھی تو قاسم ہال میں ہے۔ اگر وہ شہر گیا ہوا تو کھانا وہاں سے کھا کر آئے گا... ہوسکتا ہے کہ آرام کر رہا ہو اور شہر نہ گیا ہو۔'

وہ ان خیالوں میں مصروف چلتا رہا، اسے احساس ہی نہ رہا کہ میس کی طرف مڑنے کا قریبی راستہ تو وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اس وقت قاسم ہال کے داخلی دروازے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

اس نے سوچا کہ وہ اندر ہال میں چلا جائے اور محمود کے متعلق دریافت کرے مگر اس کے ذہن نے یہ بات قبول نہ کی اور وہ سیدھا چلتا رہا۔ سامنے کیفے ٹیریا کی عمارت تھی، بہت سے لڑکے اس عمارت کے دروازے پر کھڑے دکھائی دیے۔

'ہوسکتا ہے محمود ان میں ہو۔' اس نے سوچا۔ وہ گردن ہلا کر بڑی سڑک کی طرف مڑ گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ حالاں کہ پریشانی کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اسٹاف نے منہ سے سیٹی بجانا شروع کردی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی پریشانی ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر اس کے ہونٹ خشک تھے۔ اس نے ہونٹوں پہ زبان پھیر کر انھیں تر کیا۔

وہ میس کے نزدیک آ پہنچا تھا۔

اِکا دُکا لڑکے میس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چلتا رہا۔ اسے کوئی عجلت نہیں تھی، 'میں ٹھیک وقت پر آیا ہوں...' اس نے سوچا۔

''السلام علیکم اسٹاف!'' کسی نے اسے سلام کیا۔ اس نے گردن پھیر کر اُدھر دیکھا۔

اس کے دل کی دھڑکن اک گھڑی کے لیے رُک گئی۔

اس نے کہا، ''محمود!'' مگر وہ کچھ بھی کہہ نہ پایا۔

''وعلیکم السلام! کیا حال ہے؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''آپ کی مہربانیاں ہیں اسٹاف۔'' محمود نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اسٹاف مشتاق کئی سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن خاموش رہا۔

''آج کیسے آنا ہوا اسٹاف؟'' محمود نے پوچھا۔

''فرصت تھی، میں نے سوچا چلو چکر ہی لگا لیا جائے۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔'' اسٹاف نے جواب دیا۔ اس کی سانس قدرے تیز چلنے لگی تھی، ''آپ کدھر کو نکلے ہیں؟'' اس نے محمود سے پوچھا، ''شاید کھانا کھانے کے لیے— ہے نا؟''

''ہاں اسٹاف! آپ بھی اسی میس میں کھانا کھاتے ہیں؟'' اسٹاف مشتاق کو احساس ہوا کہ وہ کھڑے ہیں۔ اس نے ہاتھ سے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''آئیں۔'' دونوں ایک ساتھ میس میں پہنچے۔

کھانا کھاتے ہوئے اسٹاف کو جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ ویسے اسے بھوک تو تھی نہیں، وہ باتیں کرتے رہے۔

محمود نے بتایا کہ وہ سارا وقت کمرے میں ہی رہا تھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ شاید آپ جمنازیم آئیں۔''

''میں نے سوچا تھا کہ جاؤں مگر یقین نہیں تھا کہ آپ موجود ہوں گے۔'' محمود نے جواب دیا۔

اسٹاف مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''میں زیادہ تر اپنے کمرے سے نہیں نکلتا ہوں، پھر یہاں کسی سے تعلق داری بھی نہیں ہے۔'' ذرا توقف کے بعد اس نے مزید کہا، ''...سوائے آپ کے۔'' وہ دل ہی دل میں یہ بات کہہ دینے پر نادم ہوا۔ اس کے چہرے پر پریشانی دکھائی دی۔

''اسٹاف آپ میرا اتنا خیال رکھتے ہیں، آپ کی مہربانی ہے۔'' محمود نے جواب دیا۔

محمود کے مسکرا دینے پر اسٹاف کی پریشانی ختم ہوگئی۔

''نہیں میں تو درحقیقت اس بات پر پشیمان ہوں کہ آپ پر صحیح طور پر توجہ نہیں دے پا رہا۔'' اسٹاف نے دھیرے دھیرے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔ اسے لگا جیسے وہ کسی بلندی کی طرف چڑھ رہا ہو۔ اس کی سانسیں ذرا سی تیز ہوگئیں۔

''دراصل آپ کا اسٹائل بالکل محمد میر جیسا ہے۔ محنت سے اس اسٹائل کو پرفیکٹ کیا جاسکتا ہے۔''

اسٹاف نے میز پر رکھی ہوئی پلیٹ سے نظریں ہٹا کر محمود کی آنکھوں میں دیکھا، جو اسے توجہ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ محمود نے نگاہیں نیچے کرتے ہوئے پوچھا، ''اسٹاف محمد میر کون ہے؟''

''محمد میر— لیفٹیننٹ محمد میر پاکستان کا انٹرنیشنل باکسر ہے۔ اسے ایشیا کا بہترین باکسر تسلیم کیا گیا تھا۔''

''کیا اب وہ باکسنگ نہیں کھیلتا ہے؟''

''نہیں! کامن ویلتھ گیمز میں اس کا ہاتھ خراب ہوگیا تھا۔ اب وہ کامپٹیٹو باکسنگ نہیں کرتا ہے۔''

محمود کچھ دیر چپ رہا۔ شاید بڑے خیال نے ذہن پر قبضہ کرلیا تھا۔

''اسٹاف! کتنے دن محنت کرنی پڑے گی؟'' اس نے دھیرے سے سوال کیا۔

''دن!'' اسٹاف نے روایتی بھاری آواز میں کہا۔ پھر فوراً آواز کو نرم اور دھیما کرتے ہوئے اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا، ''دن— نہیں سائیں! باکسنگ کا مطلب محنت!— باکسنگ معنی سچائی!''

اسٹاف سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ زیرِ لب بڑبڑانے لگا، ''ہم اس قدر محنت جاری رکھ نہ سکے، تب ہی تو رہ گئے۔''

اس نے گردن اوپر کرتے ہوئے محمود کی آنکھوں میں دیکھا، ''لیکن تم محنت کرو گے اور اس مقام تک پہنچو گے جہاں ہم نہیں پہنچ سکے... نہیں؟''

محمود نے گردن سے ہاں کی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ آنکھیں کسی گہری سوچ

کی چغلی کھا رہی تھیں۔

وہ دونوں باقی وقت خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے رہے۔ دراصل دونوں کو بھوک نہیں تھی۔ مگر دونوں اک دوسرے کی وجہ سے کافی کھانا کھا گئے تھے۔ محمود نے اسٹاف کی طرف دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو کہ 'بس؟'

اسٹاف مشتاق اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے اپنی پلیٹ میں کانٹا سیدھا کیا۔ ویٹران کے سامنے سے پڑی پلیٹیں اٹھا کر لے گیا۔ وہ پیالیوں میں سویٹ ڈش کھانے لگے۔

پیالی ختم کر کے اسٹاف نے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

دونوں اپنی کرسیوں کی دائیں جانب سے اٹھے۔ نیپکن ریک میں رکھ کر میس سے باہر نکل آئے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خوش گوار موسم لطف دے رہا تھا۔

''آپ کو جانے کی جلدی تو نہیں ہے نا؟'' اسٹاف مشتاق نے محمود کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں اسٹاف! ساڑھے نو بجے تک فراغت ہے۔'' محمود نے جواب دیا۔

''کل آپ کا کیا پروگرام ہے۔ شہر جائیں گے کیا؟''

''بالکل فارغ ہوں اسٹاف! کوئی کام ہو تو شہر جاؤں۔'' محمود نے سوالیہ نظروں سے اسٹاف کی طرف دیکھا۔

''نہیں، نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ آپ یہاں ہوں گے تو پھر ملاقات رہے گی— نہیں؟''

''میں کل آپ کی طرف آؤں؟'' محمود نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

اسٹاف نے محمود کی جانب دیکھا۔ محمود منتظر نظروں کے ساتھ اسٹاف مشتاق کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''بالکل— میں تو فری ہوتا ہوں۔ آپ جب بھی چاہیں چلے آیا کریں۔'' اسٹاف نے نرم لہجے میں کہا۔

محمود اس قدر اجازت ملنے پر کافی مسرور نظر آ رہا تھا۔

''آج موسم بہت اچھا ہے۔'' اسٹاف مشتاق نے سرسوں کی لہراتی ٹہنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

محمود نے گردن اثبات میں ہلا کر تائید کی۔

سرسوں کے پودوں کی خوش بو ہوا کو معطر کر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا ہر جھونکا اپنے ساتھ سرسوں کی مہک لاتا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف پودے قطاروں میں باادب کھڑے تھے۔

وہ ان خالی راستوں پر بہت دیر تک خراماں خراماں چلتے رہے، باتیں کرتے رہے۔

محمود نے بتایا کہ اس کا والد زمیں دار تھا۔ وہ چار بھائی تھے۔ اسے بچپن سے ہی باکسنگ کا شوق تھا مگر اسے گھر میں یا اسکول میں ایسی کوئی سہولت حاصل نہیں تھی۔ اب اسٹاف کی تحریک پر وہ باقاعدہ باکسنگ کھیلنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مکمل طور پر یہ شوق جاری رکھے گا۔

اسٹاف اسے یقین دلاتا رہا کہ وہ ہر طرح سے اس کی مدد کرے گا اور اسے محنت کرائے گا۔ بلاشبہ محنت سے ہر شے حاصل کی جاسکتی ہے۔

محمود نے ساڑھے نو بجے اسٹاف مشتاق کو الوداع کہا۔

اسٹاف کشادہ سڑک پر چلتا رہا۔ اسے واپسی کی جلدی نہیں تھی۔ خاموشی، ہوا کے جھونکے اور خالی راستے ذہنی سرور قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہو رہے تھے۔ خیالات کا بہاؤ کسی رکاوٹ کے بغیر اسی رُخ پہ بہہ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے اور سیٹی سے پرانے ہندوستانی گانے کی دھن بجاتا ہوا، چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا جمنازیم کی سمت جانے والی سڑک پہ ہو لیا۔ گانے کے اشعار تو مکمل طور پر یاد نہیں تھے مگر سیٹی اور دھن سے ہی کام چلاتا رہا۔

جمنازیم کے اک کونے میں ہیلپر فرش پر کمبل بچھائے لیٹا ہوا تھا۔ اسے ابھی نیند نہیں آئی تھی۔

''تم نے کھانا کھایا ہے؟'' اسٹاف نے محض بات کرنے کی خاطر خوامخواہ پوچھا۔

''سائیں کب کا!'' ہیلپر نے بیٹھتے ہوئے کہا، ''آپ نے بہت دیر کردی؟''

اس نے اسٹاف کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ اسٹاف خوش تھا۔

''کل بھی چھٹی ہے نا؟'' اسٹاف نے کہا، ''اچھا اب دروازہ بند کر دو۔''

اسٹاف اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک دو منٹ ہیلپر سے گفتگو کرے۔ اس نے کمرے میں پہنچ کر ہیلپر کو بلانا چاہا مگر اس کی مخصوص سنجیدہ مزاجی نے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔

وہ لباس تبدیل کرنے لگا۔ اس کا ذہن کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

وہ بوٹ اتارنے کے لیے کرسی پر بیٹھا تو کافی دیر تک چپ سادھے بیٹھا رہا۔

اسے ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ وہ کوٹ اور شرٹ اتار کر بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے جوتوں کے تسمے کھولے، کپڑے تہ کر کے صندوق میں رکھے اور بوٹ میز کے نیچے رکھ دیے۔

وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ آج اسے لائٹ آف کرنے کا کوئی خاص سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اتوار ہمیشہ مزے کا دن ہوتا ہے مگر آج تو کچھ زیادہ ہی لطف محسوس ہو رہا تھا۔

اسٹاف نے اپنے کمرے کی ترتیب درست کر کے ہیلپر کو آواز دی۔

''جی سائیں؟'' ہیلپر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

کمرے کی ترتیب نے آج اسے حیران نہیں کیا تھا۔

''کیفے ٹیریا میں کیا کیا ہوتا ہے؟'' اسٹاف مشتاق نے ہیلپر کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

ہیلپر نے حیرانی کے ساتھ اسٹاف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''سائیں! کھانا ہوتا ہے، چائے، کافی، کبھی کبھی شربت بھی ہوتا ہے... ہاں سائیں! مٹھائی بھی ملتی ہے۔''

''اچھی کون سی چیز ہے؟'' اسٹاف نے اس کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سائیں جلیبیاں!'' ہیلپر نے فوراً جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جب مہمان آئے تو جلیبیاں اور چائے لے آنا۔'' اسٹاف مشتاق

نے دس کا نوٹ ہیلپر کو دیتے ہوئے کہا۔

محمود صبح سویرے آ گیا تھا۔

ہیلپر چائے اور جلیبیاں لے آیا۔

''اسٹاف آپ کو ہمارے کیفے ٹیریا کی جلیبیاں پسند آئیں؟'' محمود نے پوچھا۔

''بہت اچھی ہیں۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہاں اتنی اچھی جلیبیاں مل سکتی ہیں۔''

محمود بے تکلفانہ باتیں کرتا رہا۔

اسٹاف کو اس کی باتیں بھلی لگ رہی تھیں۔

اسٹاف، محمود سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ سلجھا ہوا، ذہین اور محنت کی عظمت پر پختہ یقین رکھنے والا اس عمر کا لڑکا اس نے پہلی بار دیکھا تھا جس کے پاس اس کم سنی میں سخت اصول تھے۔ وہ دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔

ان کا زیادہ تر موضوع 'ٹریننگ' رہا۔

اسٹاف مشتاق کو یقین تھا کہ باکسنگ کے لیے بنیادی طور پر جو صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں، وہ محمود میں موجود تھیں۔ باقی رہی محنت تو وہ محمود کے اپنے اختیار میں تھی۔ راہ نمائی کے لیے وہ موجود تھا۔ محمود تہیہ کر چکا تھا کہ وہ اپنا وقت باکسنگ کے لیے صرف کرے گا۔ اسے یقین تھا کہ صحیح طور پر محنت کرنے سے وہ اچھا باکسر بن سکے گا۔ رہ رہ کر اس کے ذہن میں اسٹاف کی بات گردش کر رہی تھی کہ باکسنگ معنی 'لگن'... باکسنگ معنی 'سچائی!'

محمود کا کھیل پہلے سے بہت اچھا ہو گیا تھا۔

کالج میں جتنے بھی سینئر باکسر تھے، محمود ان کو بآسانی مات دے دیتا تھا۔ اس کے کھیل میں ترقی نے سب کو حیران کر دیا تھا۔

اسٹاف مشتاق کے ساتھ اس کی خوب بیٹھکیں ہونے لگی تھیں۔ اسے جب بھی موقع ملتا، وہ جمنازیم پہنچ جاتا تھا۔ اسٹاف مشتاق بھی کھانا اکثر میس میں کھانے لگا۔

بدھ کے روز اسٹاف مشتاق نے وارم اَپ ایکسر سائزوں کے بعد محمود کو اسپائرنگ کے لیے کہا۔ وہ خود گلوز پہن کر رِنگ میں آ گیا۔

حیران و پریشان محمود اسٹاف کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کا منہ کھلا ہوا تھا، آنکھوں میں بے یقینی اور اہمیت کے ملے جلے تاثرات تھے۔

''صرف یہ خیال رکھیے گا کہ میں ناک آؤٹ نہ ہو جاؤں، باقی سب چلے گا۔'' اسٹاف نے ہنستے ہوئے کہا۔

محمود نے نظریں جھکا لیں، اس کا چہرہ گلابی ہوگیا۔ اسٹاف نے محمود کو اسپائرنگ کروائی۔ لیفٹ سائیڈ شفٹنگ، موومنٹ ان سرکل، سوی بیک وغیرہ پہ بطورِ خاص توجہ دلائی۔

محمود کا فٹ ورک بہتر ہوگیا تھا۔ مگر مکوں میں زیادہ طاقت نہیں تھی۔ ممکن ہے اسٹاف کی تعظیم کی وجہ سے وہ پوری قوت استعمال نہ کر رہا ہو۔

تین راؤنڈ کی اسپائرنگ کے بعد اسٹاف مشتاق اور محمود اپنی اپنی کرسی اور بنچ پہ بیٹھ گئے۔ وہ دونوں لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔'' اسٹاف نے مسکراتے ہوئے کہا، ''آئندہ آپ کو میں خود پریکٹس کراؤں گا۔''

محمود نگاہیں جھکائے رنگ کے قریب زمین پر پڑے سلور کے جگ کو دیکھنے لگا۔

''آپ صرف اپنے مکوں میں تھوڑی پاور لائیں۔'' اسٹاف نے پھر کہا۔

''ٹھیک ہے اسٹاف!'' محمود نے اسٹاف مشتاق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سب کو یقین تھا کہ اگر محمود اسی طرح چار پانچ ماہ محنت کرتا رہا تو نیشنل چیمپئن شپ جیتنا اس کے لیے مشکل نہ ہوگا۔ اسٹاف نے اس کی اپنے ساتھ اسپائرنگ کی روٹین جاری رکھی۔

محمود کو بھی یقین تھا کہ اس طرح اسٹاف کے ساتھ چند مہینے پریکٹس کرنے کے بعد اس کی خامیاں دور ہوجائیں گی۔ اس کے جوابی داؤ بہتر ہو جائیں گے اور دفاعی صلاحیت بڑھ جائے گی۔ اس کا شوق اور جوش روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

حسبِ معمول ہال میں لڑکے پریکٹس کر رہے تھے۔

اسٹاف مشتاق اک لڑکے کو پنچنگ بال پر پریکٹس کرنے کا طریقہ بتا کر محمود کی طرف آ گیا، جو رسّی کود رہا تھا۔

اسٹاف مشتاق اسے چند ایکسر سائزیں بتانے لگا۔ اسٹاف کی ہدایات توجہ سے سننے کے بعد محمود ایکسر سائزیں کرنے لگا۔ اس کی توجہ اور شوق دیکھ کر اسٹاف مشتاق کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''سائیں! آپ کا یہ خط آیا ہے۔'' ہیلپر نے اسٹاف کو لفافہ تھماتے ہوئے کہا، ''سائیں کل سے آفس میں پڑا تھا، میں اٹھا کر لے آیا ہوں۔''

اسٹاف نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری تشویش تھی، ''کل آیا تھا؟'' اس نے بلاوجہ بولتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

''جی سائیں! دفتر والے بہت ست ہیں۔ پہلے میرا خط ایک ہفتے دفتر میں پڑا رہا تھا۔ جب میں خود گیا تو لے کر آیا!'' ہیلپر نے شکایتی انداز میں کہا۔ اس کے لہجے میں اپنی کارکردگی کے حوالے سے فخر بھی شامل تھا۔

اسٹاف نے کراچی والے مکرانی کی لکھائی پہچان لی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ لفافہ کھولا اور کھڑے کھڑے پڑھنے لگا۔ خط پڑھ چکنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک یوں ہی کھڑا رہا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

محمود اسٹاف کو کافی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایکسر سائز کرتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اسٹاف کو دیکھتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسٹاف پریشان تھا۔ محمود بھی پریشان ہوگیا۔ وہ ایکسر سائز چھوڑ کر اسٹاف کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ اسٹاف مشتاق اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسے محمود کی موجودگی کا بالکل بھی احساس نہ ہوا۔

''اسٹاف! خیریت تو ہے؟'' محمود نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

''کیا؟— ہاں!...'' اسٹاف نے اپنے خیالات سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ اس نے محمود کی آنکھوں میں پریشانی دیکھ کر خود کو سنبھالا۔

''سب خیریت ہے۔ دوست کا خط آیا، کراچی سے— دراصل وہ میرا پارٹنر ہے، بزنس میں—'' اسٹاف نے کہا۔

محمود اسے دیکھتا رہا۔

''دراصل وہ بزنس شروع کرنے والا ہے، اسی سلسلے میں خط لکھا ہے...'' اسٹاف نے بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش ہوگیا اور محمود کو دیکھنے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ یہ بات محمود کو کیسے بتائے۔

''آپ کھڑے نہ ہوجائیں، پیٹ کی چند ایکسر سائزیں کرلیں... ہاں ہاں! پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔'' اس نے محمود کو تسلی دی، ''سب خیریت ہے۔''

محمود ایبڈامینل بورڈ کی طرف چلا گیا تو اسٹاف سوچنے لگا کہ اس نے محمود سے اپنا بزنس شروع کرنے کا ذکر کیا تھا کہ نہیں؟

''ہوسکتا ہے ابتدائی ایام میں سرسری سا ذکر ہوا ہو تو ہو— ایسی کوئی بات یاد تو نہیں آ رہی تھی!'' اس نے سوچا۔

اب تو اسے یہاں آئے چھٹا مہینہ شروع ہوچکا تھا۔ وہ تو مکرانی والی بات ہی بھول چکا تھا۔ وہ اس وقت بہت زیادہ پریشان تھا اور اس کا سنجیدہ چہرہ مزید سنجیدہ لگ رہا تھا۔ اس نے محمود کی طرف دیکھا، جو پیٹ کی ایکسر سائز میں مصروف تھا۔ اس کا چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ وہ تختے پر پھرتی سے پش اَپ نکال رہا تھا۔ اسٹاف گردن پھیر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ ہیلپر سامان سنبھالتے ہوئے، اسٹاف کو حیران نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اسٹاف انسان تو بہت اچھا ہے۔'' اس نے زیر لب سرگوشی کی، 'مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا' اس نے ذہن کو صاف کرتے ہوئے سوچا، اسے یہ آدمی عجیب لگا تھا۔

سارے لڑکے چھ بجے چلے گئے تھے۔ مگر محمود اپنی ایکسر سائزوں میں مصروف تھا۔ وہ دوسرے لڑکوں سے زیادہ ایکسر سائز کیا کرتا تھا۔

اس کی نظریں نیشنل ٹائٹل پر تھیں۔ وہ ذہین تھا مگر پڑھائی میں زیادہ محنت نہیں کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے گزشتہ ٹرمینل ٹیسٹ میں پینسٹھ فی صد نمبر حاصل کیے تھے۔ اس کا سارا دھیان باکسنگ کی طرف تھا۔

محمود ایکسر سائز ختم کرنے کے بعد سفید تولیے سے چہرے کا پسینا پونچھتا ہوا اسٹاف کی طرف چلا گیا۔

اسٹاف لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی، وہ کسی گہری سوچ میں غرق لگ رہا تھا۔ محمود، اسٹاف کے سامنے پڑی ہوئی بنچ پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی تشویش عیاں تھی۔ وہ چپ چاپ منتظر نگاہوں کے ساتھ اسٹاف کو دیکھتا رہا۔ اسٹاف نے گردن اٹھا کر دیکھا، سامنے محمود بیٹھا تھا۔ اسٹاف تھوڑی دیر تک محمود کو دیکھتا رہا، جو پریشان نظروں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''موسیٰ کا خط آیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ...'' اسٹاف نے دھیمے لہجے میں کہا، ''اب پوسٹنگ پوری ہونے والی ہے اور وہ کاروبار شروع کرنے کے لیے مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ اس سے وعدہ کر رکھا ہے...'' اسٹاف خاموش ہوگیا، وہ دوبارہ سوچ میں پڑ گیا۔

محمود کے ذہن میں ارتعاش پیدا ہوگیا، اس کا چہرہ اُتر گیا۔

اسٹاف یہاں آپ کی پوسٹنگ کتنے ماہ کے لیے ہوئی تھی؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

اسٹاف مشتاق کو سوال سمجھ میں نہ آیا۔ وہ خیالوں میں کافی دور نکل گیا تھا۔

''آپ نے کیا پوچھا؟'' اس نے گردن اوپر کر کے کہا۔

اس کی نظریں محمود کے اترے ہوئے چہرے پہ ٹک گئیں۔ اسے محمود کا سوال پوری طرح سمجھ آگیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

اسٹاف مشتاق نے آنکھوں پر دباؤ ڈالا، محمود اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی امید پر آخری وار کرتی ہوئی صاف دکھائی دی۔

محمود کی یہ کیفیت دیکھ کر اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنا چاہا۔

''...آپ فکر نہ کریں، میں اپنا پیریڈ ایکسٹینڈ کروالوں گا...''

اس نے سوکھے ہونٹوں پہ زبان پھیری۔

مگر آواز نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

مریض

عظیم حسبِ معمول صبح سویرے بیدار ہوا تھا۔

ذہن میں یہی خیال تھا کہ وہ آج روزمرہ کی 'مارننگ واک' پر نہیں جائے گا۔

وہ اپنی یہ روٹین توڑنے کے لیے کسی بہانے کے لیے اپنا ذہن ٹٹولنے لگا۔

بہانے تو بہتیرے ہیں— مثلاً:

وہ رات کو دیر سے سویا تھا۔

گھر میں مہمان بھی آیا ہوا ہے۔

گھر میں مہمان اور اس کے سوا کوئی بھی نہ تھا، مہمان کو تنہا چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔

آج اس کے پاس معقول بہانے موجود تھے۔ پھر آخر وہ چہل قدمی پہ کیوں جائے؟

اسے ڈاکٹر کی تاکید یاد آگئی کہ وہ صبح سویرے تازہ ہوا میں سیر پہ جانا کسی بھی قیمت پہ ناغہ نہ کرے۔

یہ بات ذہن میں آتے ہی اس کی ناغے کے ارادے کی عمارت میں دراڑیں پڑنا شروع ہوگئیں۔

وہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے سینک کی طرف بڑھا۔ آج وہ خود کو توانا محسوس کر رہا تھا۔ ویسے اس قسم کا کوئی بھی بہانہ اسے صبح کی چہل قدمی سے روکنے کے لیے کافی ہوتا۔

عظیم شہر میں ملازمت کرتا تھا اور وہیں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔

مکان کیا تھا بس اک کمرہ، باورچی خانہ اور باتھ روم۔

اس 'انگلش باتھ روم' کی وجہ سے ہی عظیم کو ہر ماہ سو روپے اضافی کرایہ دینا پڑتا تھا۔ لیکن اس معاملے میں عظیم کا بچت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ صفائی ستھرائی کا قائل تھا اور اس معاملے میں کوئی بھی کوتاہی پریشانی کا باعث بن جاتی تھی۔

پریشانی کے عالم میں وہ فوراً غصے میں آجاتا تھا۔ اسے یہ بات بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ آخر وہ خفا کیوں ہے؟

یہ خیال اس کے غصیلے مزاج کو بڑھاوا دیتا تھا۔

اسے نوکری ملے قریباً آٹھ ماہ ہوئے تھے۔ یہیں اس کی طبیعت سخت خراب ہوئی اور کسی دوست کے توسط سے ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر صرف ان شرائط پر علاج کرنے کو رضامند ہوا تھا کہ عظیم ڈاکٹر کی ہدایت کے بغیر کوئی بھی قدم نہیں اٹھائے گا اور علاج ہر قیمت پر جاری رکھے گا۔

ڈاکٹر دل چسپ آدمی تھا۔ اس کے رویے نے عظیم کو متاثر کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مایوسی کے اتنے دوروں کے باوجود ڈاکٹر کے مشورے پر عمل پیرا رہنے کی کوشش کرتا رہا۔

اس کا وزن گھٹ گیا تھا۔

ڈاکٹر کا اصرار تھا کہ وہ ہلکی پھلکی غذائیں کھائے، بھوک نہ ہونے کی صورت میں بھی فاقہ نہ کرے۔ سبزیوں کو ترجیح دے۔ میوہ جات کھانے کی بھی ہدایت کی تھی۔

عظیم نے اپنی زندگی سے ہر بات منفی کردی تھی۔ اسے کسی بھی بات سے دل چسپی نہیں رہی تھی۔

وہ بیشتر وقت خیالوں میں کھویا رہتا۔ جب وہ تھک جاتا تو چارپائی پر لیٹا رہتا اور چھت پہ نگاہیں جمائے مسلسل تکتا رہتا تھا۔

وہ سوچتا تھا کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟

یہ کتنا عرصہ ساتھ دے گی؟

اسے بسر کرنا ضروری کیوں ہے؟

آفس سے واپس آنے کے بعد وہ گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔
رات کو محلے کے ہوٹل سے سبزی روٹی خریدتا اور گھر لا کر کھایا کرتا تھا۔
کبھی کبھار جا کر کڑھائی والے سے گرم دودھ کا اک پیالہ پی آتا تھا اور بس۔
یہ تھی اس کی کل کائنات۔
زندگی کے پُر پیچ راستوں پر کسی اجنبی کی طرح پریشان پھرتی سوچ میں گھنٹوں گزر جاتے تھے۔
یہاں اس کی کسی سے بھی راہ و رسم نہیں تھی۔
اگر ساتھ تھا تو کھانسی کا تھا جو وقفے وقفے سے آ کر یارانہ نبھاتی رہتی تھی۔ اس عمل کے نتیجے میں وہ خود کو زیادہ کم زور محسوس کرتا تھا۔
ایک روز قبل گاؤں سے رشید میڈیکل کالج میں داخلہ فارم جمع کرانے آیا تھا۔ اس کے نمبر اچھے تھے، لہٰذا دونوں کو یقین تھا کہ داخلہ مل جائے گا۔ اسے ڈاکٹر بننے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ وہ اپنے چچا کے ساتھ گاؤں کے شفاخانے میں کام کرتا تھا۔
وہ اکثر شہر سے ادویات لے کر جاتا تھا اور جو مریض اس کے چچا کے پاس علاج کرانے آتے تھے، وہ دونوں مل کر اس کا علاج کرتے تھے۔
رشید کے چچا کے ہاتھ میں 'قدرتی شفا' تھی۔ اس لیے اس کا شفاخانہ اچھا چلتا تھا۔ اس کا ایک ہی خواب تھا کہ وہ 'اصلی ڈاکٹر' بنے گا۔
وہ شہر سے علاج معالجہ کرا کر لوٹنے والے مریضوں کے کاغذات وغیرہ انتہائی توجہ کے ساتھ دیکھا کرتا۔ ڈاکٹروں کی تجویز کردہ ادویات، مریضوں کی کیفیت اور حالات ذہن نشین کر لینے کی وجہ سے وہ شفا خانے میں اپنے چچا کو 'اچھے خاصے' مشورے دے سکتا تھا۔
تازہ ہوا میں گھومنا پھرنا زندگی پیدا کرنے کی خاطر ہوتا ہے... میں آج ویسے ہی ہشاش بشاش ہوں، پھر ہوا خوری کی کیا ضرورت...
چہرے پہ پانی لگنے کے باعث اب وہ نیند کے خمار سے نکل چکا تھا۔

تازہ ذہن نے مارننگ واک والی بات کو ختم کرنے والے بہانے کو پہچان لیا۔

وہ پیروں میں جوگر پہن کر باہر نکل گیا۔ قدرے طویل چکر لگا کر واپس لوٹ آیا اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔

اس کا ذہن بیتے دنوں کے بابت سوچنے لگا۔

اسے اس بات پہ حیرت ہونے لگی کہ رات کو دیر تک جاگنے کے باوجود وہ ہر روز خود کو پہلے سے زیادہ تندرست محسوس کر رہا تھا۔

دروازے کی درز سے اخبار اندر آ گرا اور گلی میں سائیکل گزرنے کی آواز سنائی دی۔

اس نے جلدی سے اٹھ کر اخبار اٹھا لیا۔ اسے اک لمحے کے لیے اپنی چستی پہ حیرت انگیز خوشی ہوئی۔

وہ صرف تعطیل کے روز گھر پہ اخبار منگواتا تھا وگرنہ تو آفس کے اخبار سے ایک دو خبریں پڑھ کر جان چھڑا لیتا تھا۔

عظیم نے جلدی جلدی اخبار کے صفحات الٹے پلٹے۔ وہ صفحۂ اوّل میں دل چسپی نہیں رکھتا تھا۔

اس نے اندرونی صفحات پر فلمی اشتہارات دیکھنا شروع کر دیے۔

''رشید بھی آیا ہوا ہے... کوئی اچھا سا انگریزی ناٹک دیکھا جائے، اس کی نگاہیں مختلف اشتہارات کا جائزہ لینے لگیں۔

گزشتہ چھ ماہ کے دوران اس نے ایک بھی فلم نہیں دیکھی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ دیرینہ شوقین ہونے کے باوجود اتنا عرصہ اسے فلم کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

وہ تو بس گھر میں بیٹھا خیالات کی الجھن میں گرفتار رہتا تھا۔

اس نے حیرت اور دکھ کے ساتھ اپنی گزشتہ زندگی کا تصور کیا۔

اس کا گھر سے نکلنا، آفس جانے اور محلے کے ہوٹل سے کھانا لینے کے علاوہ بس کوئی دو تین بار ہی ہوا ہوگا— انگلیوں پہ گنتی جتنے پھیرے— وہ دھیرے سے حیرت میں بڑبڑایا۔

شہر میں اس کے کئی واقف کار تھے، لیکن وہ کسی کے ہاں بھی نہیں گیا تھا۔ سوائے

ڈاکٹر کی بتائی ہوئی صبح کی چہل قدمی کے جو اس نے ہمیشہ کڑوی دوا کی ایک خوراک سمجھ کر کی تھی، وہ گھر سے باہر نکلنا گناہ سمجھتا رہا تھا۔

اس نے چارپائی کی جانب دیکھا، رشید گہری نیند سو رہا تھا۔ کمبل سر سے ڈھلک گیا تھا۔ اس نے گھٹنے سینے کے ساتھ بھینچے ہوئے تھے۔

عظیم کو صبح کی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اس نے اٹھ کر رشید کے گرد کمبل اچھی طرح لپیٹا اور پھر دونوں پاؤں کرسی پہ رکھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے میز سے کتاب اٹھا کر اوراق پلٹنا شروع کر دیے۔

عظیم کو کتاب دل چسپ لگی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس کا دھیان کبھی بھی کتابوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس نے اتنے سارے دن فراغت میں گزار دیے اور بوریت کا شکار ہوتا رہا تھا۔

وہ کتاب رکھ کر اس نے دوسری کتاب دیکھنا شروع کی۔ درمیان سے کھول کر پڑھنا شروع کی، وہ پڑھتا رہا۔ پھر دو چار صفحے پلٹ کر پڑھنے لگا۔ اس کے سامنے دل چسپی کا اک ذخیرہ تھا—

اس نے وہ کتاب رکھ کر تیسری کتاب کھولی۔ گلیلو کی بابت تو اس نے درسی کتب میں بھی پڑھ رکھا تھا۔ یہ کتاب بھی اسی کے بارے میں تھی۔ وہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا، 'یہ کتاب آج ہی لے کر آؤں گا۔' اس کے ذہن نے پکارا۔

کتاب میز پر رکھ کر اس نے پاؤں کرسی سے نیچے کر لیے۔ کرسی سے ٹیک لگا کر اس نے پاؤں پسار لیے اور دونوں بازو سر کے پیچھے رکھ کر خود کو خیالوں کی دنیا میں گھومنے کے لیے چھوڑ دیا۔

کتنا، وحشت ناک وقت گزر چکا تھا۔ وہ اپنی صحت کے حوالے سے فکرمند رہا تھا۔ اسے یہ یقین تھا کہ وہ ٹی بی میں مبتلا تھا اور یہ متعدی بیماری ہے۔ اس مرض میں مبتلا فرد کے ساتھ کھانے پینے اور نشست و برخاست سے لگ سکتی ہے۔

ڈاکٹر نے یہ تلقین کی تھی کہ وہ دیگر افراد سے الگ کھائے پیے، کھانستے وقت منہ

پر رومال رکھا کرے، تھوک ہمیشہ تھوک دان میں پھینکے اور اس کا ڈھکنا بند رکھا کرے۔

اس نے گھر سے نکلنا ترک کر دیا تھا۔

اسے شک تھا کہ ڈاکٹر اسے صحت اور حالت کے متعلق سچائی نہیں بتاتا تھا۔ اس نے کئی بار ڈاکٹر سے پوچھا لیکن اس نے ہمیشہ اسے حوصلہ رکھنے کا کہا تھا۔

وہ ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، بس دوا کھاتا رہے۔

عظیم کو یوں محسوس ہوتا جیسے ڈاکٹر کسی بچے کو حوصلہ دے رہا ہو۔

اسے شک تھا کہ اس کی ٹی بی آخری اسٹیج پر تھی۔ کبھی کبھی تو یقین ہو جاتا کہ وہ اس بیماری کی وجہ سے جلد ہی مر جائے گا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے یہ بیماری کسی دوسرے کو منتقل ہو۔

شاید یہی وجہ تھی کہ وہ نوکری چھوڑ کر گاؤں جانے کے ارادے پر عمل نہیں کر سکا تھا۔ اس کی زندگی اندھیرا تھی، انتظار تھی اور بس!

اچانک کل گاؤں سے رشید چلا آیا۔

اس نے عظیم کی ساری دوائیں دیکھیں، ڈاکٹر کے کاغذات اور ایکسرے وغیرہ سب کچھ اس نے بغور پڑھا۔ کچھ دیر کے لیے اس کے چہرے پہ فکرمندی کے آثار موجود رہے۔

رشید نے عظیم کو اپنی طرف دیکھتا پایا تو اس کے چہرے پر ایک دل کش مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تمھارا کیا خیال ہے، یہ دوائیں ٹھیک ہیں؟''

عظیم نے فکرمندانہ لہجے میں پوچھا تھا۔

رشید کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہوگئی۔ اس نے جواب دینے کے بجائے سوچتے ہوئے شکوہ کیا، ''آپ کی طبیعت ناساز رہی اور آپ نے کبھی بھی ہم سے یہ بات نہ کی۔''

عظیم لمحے بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا، ''بھائی! مجھے ٹی بی ہے!''

اس نے ہولے سے جواب دینا شروع کیا، ''میں گاؤں جا کر رشتے داروں کو پریشان کرنا نہیں چاہتا۔''

اس نے بات ختم کی۔ رشید اسے غور سے دیکھتا رہا۔

عظیم نے پھر کہنا شروع کیا، ''آپ کو تو پتا ہی ہے، یہ متعدی مرض ہے، یہ بیماری گھر میں پھیل سکتی ہے۔'' وہ خاموش ہوگیا۔ ''میری زندگی مزید چند دن... میں کسی کو بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا...'' اس کی آواز بھرا گئی، وہ چپ ہوگیا۔

رشید چپ چاپ عظیم کو دیکھتا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ عظیم ابھی مزید باتیں کرے گا۔

عظیم کم گو تھا۔ اسی وجہ سے بولنے میں تکلیف برت رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ کمرے میں چھائی خاموشی سے پریشان ہوگیا۔ اس نے رشید کی طرف دیکھا جو اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

عظیم نے اندرونی گھبراہٹ سے جانا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

اس کا ذہن صاف نہیں تھا۔ اس نے پھر آہستہ آہستہ سے بولنا شروع کیا، ''یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ کوئی عزیز بیماری کے خوف سے دور رہے تو انسان کو دکھ پہنچتا ہے۔ اسی لیے میں نے کسی سے بات نہ کی۔ یہاں تنہا رہتا ہوں تاکہ میری وجہ سے کسی کو پریشانی نہ ہو، میرا وقت گزر جائے گا۔''

اب وہ زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا، ''گاؤں والے یہ بیماری کی بات مخفی رکھتے بھی نہیں۔ وہ تو شہر میں ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے کہ عظیم کو ٹی بی ہوگئی ہے اور وہ اب مرنے والا ہے۔ کیا تو مذاق بن جاتا پورے شہر میں... جوانی میں یہ مرض کیسے لگا ہے...''

عظیم خاموش ہوگیا۔ اس نے گردن اٹھا کر رشید کی طرف دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ رشید اس کے خیالات سے اتفاق کرے گا۔

رشید کے چہرے پہ مسکراہٹ ابھر آئی اور یہ مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی، وہ ہنسنے لگا... ''واہ بھائی واہ! بڑی زبردست بات کی ہے۔ بے شک میں آپ کو مان گیا۔ واہ واہ!'' رشید نے زور سے دونوں ہاتھ رانوں پہ مارے اور ہنسی میں لوٹ پوٹ ہوگیا۔

عظیم اس کی طرف حیرت کے ساتھ دیکھتا رہا۔

جب رشید کی ہنسی تھمی تو اس نے چہرے پہ سنجیدگی لاتے ہوئے کہنا شروع کیا،
''بھائی ٹی بی بیماری تو واقعی خطرناک ہے مگر اب یہ بچوں کا کھیل بن چکی ہے۔ پہلے تو کوئی ٹی بی کا مریض بچتا ہی نہیں تھا مگر اب تو ٹی بی کی وجہ سے کوئی مرتا نہیں ہے۔ اس کا علاج آسان ہے اور سہولت کے ساتھ کرایا جاسکتا ہے۔ یہاں تو اسّی فی صد افراد پر ٹی بی کے اثرات ہیں۔ باقی مزید کتنے افراد کو اپنی لپیٹ میں لے گی؟ یہ الگ بات ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس بیماری کا علاج طویل عرصے تک کرنا پڑتا ہے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔''

رشید کے چہرے پر سدا بہار مسکراہٹ موجود تھی۔ وہ طویل قامت تھا، بال چھوٹے اور دل کش نین نقش۔

عظیم جو اس کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا، اس نے آہستگی کے ساتھ گردن ہلائی۔ ہوسکتا ہے رشید ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ پھر اس کے ذہن میں دوسرا خیال آیا۔

''بھلا کوئی بھی سچ کیسے بتائے گا! ہر کوئی ہمدردی میں تسلی دیتا ہے...''

وہ ہمدردی کے تصور سے کافی دکھ محسوس کر رہا تھا۔ کوئی کیوں ہمدردی کرے... وہ ایسا کم زور بھی نہیں تھا کہ کوئی اس سے ہمدردی کرے۔ اسے اس لفظ سے ہی چڑ تھی۔

''یہ عام سی تکالیف ہیں۔'' رشید کہہ رہا تھا۔ ''باقی اذیت دہ بیماریوں سے پناہ مانگنی چاہیے، مثلاً دل کی تکلیف، کینسر وغیرہ۔''

اس نے عظیم کی آنکھوں میں جھانک کر جیسے عظیم کے خیالات کو جانچتے ہوئے کہا، ''آپ کسی بھی اچھے ڈاکٹر سے پوچھیں گے تو وہ آپ کو یہی بات بتائے گا، ہمارا تو بیماریوں سے بہت واسطہ رہتا ہے۔''

عظیم کو یوں محسوس ہوا جیسے رشید کو اس کے خیالات کا پتا چل گیا ہو۔

اسے اپنے عدم اعتبار والے خیالات پر ندامت محسوس ہونے لگی۔

اس نے گردن جھکاتے ہوئے دھیرے سے کہا، ''آپ صحیح کہہ رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔''

وہ دونوں شہر گئے تھے۔ واپسی پر ہوٹل سے کھانا لیتے آئے جو انھوں نے گھر پہنچ

کر کھایا تھا۔

باتیں کرتے کرتے کافی رات بیت گئی۔ رات گئے انھوں نے سونے کی تیاری کی۔

عظیم نے اپنے لیے بستر نیچے فرش پہ بچھا لیا۔

رشید نے اسے چارپائی پر سونے کا کہا۔

عظیم کا اصرار تھا کہ مہمان بہرکیف چارپائی پہ سوئے۔

رشید چار دن بڑا ہونے کی وجہ سے اسے چارپائی پہ سونے کے لیے اصرار کرتا رہا۔

آخرکار رشید نے فرش پہ پڑے بستر سے رلّیاں☆ اٹھا کر چارپائی پر بستر کو مزید گرم کرنا چاہا تاکہ بڑھتی ہوئی ٹھنڈ سے بچا جا سکے۔

عظیم نے اپنی متعدی بیماری کا معقول سبب بتا کر، مہمان کو تکلیف سے بچانے کا اظہار کیا تھا مگر رشید نے قہقہہ لگا کر اس بات کو معمولی ثابت کرتے ہوئے ختم کر دیا تھا۔

وہ دونوں چارپائی پر لیٹ گئے۔

عظیم حیرانی کے ساتھ سوچتا رہا کہ رشید جیسا باخبر انسان اس مرض سے خوف زدہ کیوں نہیں ہے؟ اسے شرمندگی کا احساس بھی تھا کہ وہ کسی دوسرے کو خطرے سے دوچار کر رہا تھا۔

رشید اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی قربت کے باعث عظیم میں حوصلہ پیدا ہوا۔ رشید کے خلوص کی بدولت اسے بہت خوشی ہوئی تھی اور اس کا دل بھر آیا تھا۔ وہ ٹی بی کا مریض تھا مگر رشید اس بات کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ اُسی چارپائی پر سویا تھا۔

وہ اس مرض کی ہیبت سے بھی خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔

عظیم کی آنکھیں بھیگ گئیں، دو گرم آنسو آنکھوں کے اطراف سے بہہ کر تکیے میں جذب ہو گئے۔

ان دو آنسوؤں نے جیسے راستہ ڈھونڈ نکالا، پھر تار سی بندھ گئی۔

رشید نے محسوس کیا کہ عظیم بولتے بولتے اچانک چپ ہو گیا۔ اتنی جلدی تو اسے نیند نہ آئی ہوگی۔

☆ رلّیاں: لحاف/کھیس نما بچھونا جو سندھی عورتیں رنگین کپڑوں کی کترنیں جوڑ جوڑ کر بناتی ہیں۔

اس نے عظیم کو پکارا، جواب آنے میں تاخیر ہوئی۔

رشید نے اپنا ہاتھ عظیم کی پیشانی پر رکھا۔

شاید وہ اس کی صحت کے متعلق یقین کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ عظیم کی آنکھوں سے بہتے اشکوں سے تر ہوگیا۔

عظیم رونے والی بات ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ اپنی کم زوری ظاہر ہوجانے پر خفا نہیں ہوا تھا۔ اسے اس بات پر حیرت ہونے لگی۔

جب رشید نے اس کے آنسو پونچھے تھے تو اسے خوشی کا احساس ہوا تھا۔

اس نے عظیم کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا اور اپنا سر تکیے پہ عظیم کے سر کے ساتھ ملا کر سو رہا، وہ خاموش تھا۔

شاید وہ کچھ کہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ خاموشی کو ہی بہتر زبان تصور کر رہا تھا۔

وہ دونوں خاموش تھے، جانے کب اسے نیند آ گئی۔

وہ صبح سویرے بیدار ہوگیا تھا۔ مگر آج خود کو روزانہ سے کہیں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ کرسی پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا، ''کیوں نہ مارکیٹ سے سبزی لاکر پکائی جائے۔ اس نے چارپائی کی طرف دیکھا، رشید ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا، میز سے پیسے اٹھا کر آہستگی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

سوزن

میں نے گردن گھما کر اندر آنے والی غیر ملکی لڑکی کو دیکھا۔ میں چونک پڑا، وہ بے حد خوب صورت تھی۔ میں نے عنایت کی طرف دیکھا۔ وہ ہر بات سے بے نیاز فوٹو گرافر سے حساب کتاب کرنے میں مصروف تھا۔

ہم نے دکان میں موجود ٹرانسپیرنٹ فلم کے سارے رول خرید لیے تھے اور دکان دار ان کی فروخت پر منافع خوری کا ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس غیر ملکی لڑکی نے بھی دکان دار سے ٹرانسپیرنٹ فلمیں طلب کیں، دکان دار نے کندھے اُچکا کر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بھن بھن کر کے ہاتھ سے عنایت کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکی نے کچھ سمجھا یا نہیں، بہرحال اسے یہ بات ضرور سمجھ آ گئی ہوگی کہ یہ شخص اس کی کوئی مدد کر سکتا ہے۔ لڑکی سلجھی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اس نے اپنی ضرورت مختصراً عنایت کو بتائی۔

''میں نے خود رول یہاں سے خریدے ہیں، بتایئے بھلا آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' عنایت نے مخصوص روکھے پن کے ساتھ جواب دیا۔

''اوہ! آئی ایم ایکسٹریملی سوری، آئی تھاٹ یو آر دی پرسن کنسرنڈ وِد دی سیلز۔''

اس نے بے انتہا نرمی کے ساتھ کہا اور دوبارہ دکان دار کی طرف رخ کر کے اس سے پوچھنے لگی، ''اچھا چترال میں اور کہاں سے رول ملیں گے؟ مجھے از حد ضرورت ہے۔''

دکان دار نے حسبِ سابق اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کچھ من من کی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کتنے فی صد انگریزی تھی اور کتنے فی صد چترالی۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ اس لڑکی نے عنایت کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا، ''آئی ایم گون ٹو انڈر سٹینڈ دیٹ... آپ شیندور پاس جا رہے ہیں اور وہاں یہ رول فروخت کریں گے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو آپ مطلوبہ رقم کے عوض کم از کم چار رول مجھے یہیں دے دیں۔''

عنایت کے چہرے پر جو رنگ ابھرا اسے کیا معانی دیتا۔ میں تو بالکل ڈر گیا تھا اور چاہا کہ کوئی جواب دے کر اس کے غصے کا راستہ بند کردوں، مگر عنایت نے نہایت مناسب لہجے میں بے انتہا سنجیدگی کے ساتھ اپنی مخصوص بھاری آواز میں کہنا شروع کیا، ''یہ حقیقت ہے کہ میرے پاس وافر مقدار میں فلم رول ہیں لیکن جیسا کہ میں پروفیشنل فوٹوگرافر ہوں، لہٰذا یہ میرے ذاتی استعمال کے لیے بھی پورے نہیں ہیں۔ میں فلم رول فروخت کرنے والا نہیں ہوں، البتہ میری تصویریں ضرور کمرشل مارکیٹ کرتی ہیں...'' اس کی آواز میں نرمی کو محسوس کرکے میں نے اطمینان کا سانس لیا، وہ کہہ رہا تھا، ''میں سمجھتا ہوں آپ کو جو غلط فہمی ہوئی ہے، اس کی وجہ اس سادہ آدمی کی زبان ہے جو شاید وہ خود بھی پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔''

جب ہم شندور پاس پہنچے تو وہاں بادل چھائے ہوئے تھے اور سردیوں کی ابر آلود گھٹا کی مانند ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہر سمت چھوٹے بڑے خیمے گڑے تھے۔ کہیں خاکی رنگ کے پرانے ناپسندیدہ تو کہیں شوخ رنگوں کے محرابی اور گول نگاہوں کو بھلے لگنے والے۔ چھوٹی بڑی ٹولیاں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ کسی کے چہرے پر برسات کے باعث پیدا ہونے والی تکالیف کے آثار نہیں تھے۔ ہر کوئی متوقع لطف کے تصور میں خوش دکھائی دیتا تھا۔ ہم نے بھی ایک مناسب جگہ پر اپنا خیمہ ایستادہ کیا۔

شندور میں روایتی حریفوں کے مابین پولو کا مقابلہ تھا۔ یہاں کا میدان اپنی بلندی کے باعث غیر معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ سطحِ سمندر سے بارہ ہزار فٹ بلند ہونے کی وجہ سے یہاں کھیلنا واقعی انوکھا تجربہ کہا جاسکتا ہے۔ چترال اور گلگت کی وادیوں کی سرحد پر یہ ایک

ایسا عجوبہ ہے جو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ قریباً پانچ کلومیٹر ہموار خطہ ہے جس کا نصف ایک بے حد خاموش جھیل نے گھیر رکھا ہے اور یہ احساس قطعی نہیں ہوتا کہ زمین کا اتنا وسیع رقبہ زیرِ آب ہوسکتا ہے۔

عنایت نے گھوم پھر کر میدان کو ہر زاویے سے دیکھا۔ پویلین کی سیڑھیوں سے میدان کا جائزہ لیا۔ وہ عمدہ فوٹوگرافی کے لیے پُر امید دکھائی دے رہا تھا۔ ہاں البتہ کم روشنی کی شکایت میں کچھ بڑا بڑا ضرور رہا تھا۔

ڈھول پر چوٹ پڑی اور لوگ چیونٹیوں کی مانند اپنے خیموں سے نکل پڑے۔ سب کا رخ میدان کی طرف تھا۔ ایک ٹولی میں مقامی لباس میں ملبوس ایک آٹھ سالہ بچے کے دمکتے چہرے پر جو امید کا سورج چمک رہا تھا، عنایت نے وہ اپنے کیمرے میں محفوظ کرلیا۔ ایسے مواقع وہ کم ہی گنواتا تھا۔ میں پویلین کی سیڑھیوں پر بیٹھ رہا۔ عنایت تو کسی جا ٹھہرتا ہی نہیں تھا، لہٰذا اس کا ساتھ دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

یہاں پر پولو کافی تیز ہوتی ہے۔ میں کھیل دیکھنے میں محو ہوگیا، اچانک اپنے کندھے پر دباؤ محسوس کیا۔ گردن موڑ کر دیکھا تو عابد کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ''ہیلو ڈاکٹر! آئی وازشور یومسٹ بی سٹنگ سم ویئر۔ عنایت کو دیکھا تو تمھیں ڈھونڈنا شروع کردیا۔''

''کافی دنوں کے بعد تمھیں دیکھ رہا ہوں۔ تم تو بالکل ویسے کے ویسے ہی ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے اسے بانہوں میں لے لیا۔ تین سال قبل جب ملاقات ہوئی تھی تو وہ یہاں کا اسسٹنٹ کمشنر تھا۔

''آج کل کہاں ہو؟''

''یہیں!''

''کیوں بھئی، ترقی نہیں ہوئی؟''

''ترقی تو ہوئی ہے مگر ہوں یہیں۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں بھی کہوں کہ بال کیوں سفید ہو رہے ہیں۔'' میں بھی ہنستے ہوئے اسی

انداز میں بولا۔

''اس سے قبل کہ وہ جن آن پہنچے، آپ اپنا سامان اٹھوائیں اور چل کر ہمارے ساتھ رہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک ادھیڑ عمر مرد کو بلا کر کہا، ''صاحب کا سامان احتیاط سے اٹھا کر اپنے کمپلیکس کی ہماری لائن میں سیٹ کرا دیں، دیر بالکل نہیں ہونا چاہیے۔''

''لیکن اس بات کو وہ کبھی بھی پسند نہیں کرے گا۔'' میں عنایت کے غصے کا سوچ کر ڈر رہا تھا۔

''ڈاکٹر میں دھمکیاں سننے کے لیے تیار ہوں۔ تمھیں تو اندازہ ہے کہ اس کے بدلے میں کس قدر اچھی گفتگو سننے کا موقع ملے گا۔''

شیندور کے تین روزہ قیام کے دوران عنایت کی سخت مخالفت کے باوجود ہم چترال کے ڈپٹی کمشنر کی زبردست میزبانی سے مستفید ہوتے رہے۔ یہیں ہماری اس انگریز لڑکی سے دوبارہ ملاقات ہوئی جو چترال شہر میں فوٹو گرافر کی دکان پر ملی تھی۔ وہ بھی اسی رہائشی کمپلیکس کے وی آئی پی کارنر کے ایک خیمے میں رہائش پذیر تھی۔

رات کا کھانا سب لوگوں نے میس کے بڑے خیمے میں مل کر کھایا۔ وہاں عابد نے تعارف کراتے ہوئے کہا، ''یہ مرا دوست عنایت، ہم لارنس کالج میں اکٹھے پڑھتے ہیں۔ ہی از ورکنگ فوٹوگرافر۔ اور یہ ہے برطانوی صحافی مس سوزیانا جونز۔ یہ بھی فوٹوگرافی کو سمجھتی ہے۔ سوزیانا آپ عنایت کے ہنر سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں؟''

''آپ کیسے ہیں؟'' سوزیانا نے خوش اخلاقی کے ساتھ عابد سے خیریت معلوم کرتے ہوئے کہا۔

''آپ سے ملاقات ہو چکی ہے۔ اب ضرور ان کے مشورے سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔'' پھر عنایت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی، ''میں نے آپ کو میچ کے دوران کافی سرگرم دیکھا۔ آپ کس قسم کی تصویریں بنا رہے تھے؟''

''چھوٹا سا سوال، جس کے لیے بہت تفصیلی جواب درکار ہے، اگر آج کی شام

اسی کے لیے وقف کرنی ہے تو ٹھیک، البتہ اگر اس شام کچھ اور بھی کرنا ہے تو پھر مختصراً کہوں گا کہ میں نے غیر معمولی اور خوب صورت سبجیکٹ تلاش کیے۔''

''کیا مطلب؟'' سوزیانا نے فوراً پوچھا۔

''مثال کے طور پر آج میچ کے دوران آپ نے مردانہ چترالی ٹوپی پہنی ہوئی تھی جس پر ملیشیا کا مونوگرام لگا تھا۔ آپ نے میدان کے کنارے دیگر تماشائیوں کے ساتھ کھڑے ہوکر میچ دیکھا جو کہ سب مرد تھے۔ میرے لینس نے آپ کو فوکس کیا اور میں نے یہ تصویر بنالی، نہایت دل چسپ اور بے حد خوب صورت تصویر۔'' عنایت نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا تو ہر کوئی مسکرا دیا۔ سوزیانا نے شرماتے ہوئے کہا، ''تھینک یو! بٹ آئی مسٹ ہیو دس پکچر۔''

شیندور پر عنایت کی فوٹو گرافی کے حوالے سے یہ تین دن سخت مصروف گزرے۔ اس کے ہمراہ سوزیانا بھی فوٹو گرافی کرتی دکھائی دی۔ میں نے اکثر عنایت کا تھیلا اس کے کندھے پر دیکھا۔

رات کی محفلوں کا لطف ہی نرالا تھا۔ حالاں کہ ان محفلوں میں شریک اکثر لوگ خالصتاً دنیاوی اندازِ فکر رکھتے تھے اور اپنے اپنے حساب میں کامیاب زندگیاں گزار رہے تھے۔ مگر عنایت اپنے مخصوص انداز میں ایسے پہلوؤں پر گفتگو چھیڑ دیتا کہ ہنر اور فن کے لیے سب کے دلوں میں قدر بڑھ گئی۔

شیندور ٹورنامنٹ کے بعد ہمارا ارادہ دو دن کی ٹریکنگ کے بعد جیپ کے ذریعے گلگت پہنچنے کا تھا۔

سوزیانا اور اس کا میزبان ارباب جو کہ نوجوان ایم پی اے تھا، وہ بھی گلگت کے عازم تھے۔ مجھے اتنا پتا چل گیا تھا کہ سوزیانا کا دادا یا نانا انگریزوں کے دورِ حکومت میں پشاور کا کمشنر رہا تھا۔ اس نے اپنے کسی واقف کار کو خط لکھا تھا۔ یوں ارباب کے ذمے یہ میزبانی آئی تھی۔

ہم صبح سویرے نکلے تھے۔ جوں جوں شیندور سے دور ہوتے گئے، ہریالی بڑھتی

گئی۔ پروگرام کے مطابق دوپہر ایک بجے تک سوزیانا والے لینڈ کروزر میں وہاں آ پہنچے اور ہم نے دوپہر کا کھانا مل کر کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ تو ہاتھ لہراتے ہوئے لینڈ کروزر چلے گئے اور ہم پیادہ چل نکلے۔

ٹیرو سہ پہر کو پہنچے۔ ریسٹ ہاؤس میں سامان سیٹ کرنے کے بعد عنایت میلے کپڑے دھونے میں مصروف ہوگیا۔ میں برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر موسم کا لطف لینے لگا۔

''عنایت! لگتا ہے کہ سوزیانا تمھارے متعلق سیریس ہے۔'' میں شرارت کے موڈ میں تھا۔

''ڈاکٹر! جاؤ فشنگ راڈ کے ساتھ، ایک آدھا ٹراؤٹ ہی شکار کر کے لے آؤ۔ ورنہ یہاں تو آلوؤں کے سوا کوئی شے نہیں ملے گی۔'' عنایت کی سنجیدہ آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ اس کا مشورہ اس قدر برموقع تھا کہ میں مذاق بھول کر اٹھ کھڑا ہوا اور راڈ اٹھالی۔

ہم جوں ہی گلگت پہنچے، سوزیانا سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ہوٹل میں ہمارا پتا کرنے آئی تھی۔ میں نے معنی خیز نظروں کے ساتھ عنایت کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ پایا۔ گلگت کے بعد عنایت کا پروگرام ہنزہ یا اسکردو جانے کا نہیں تھا بلکہ وہ غیرمتوقع طور پر وادیِ کاغان جانا چاہتا تھا۔ سوزیانا نے جب ہمارا پروگرام دریافت کیا تو عنایت نے مختصر جواب دیا۔

''کاغان۔''

''اوہ! آئی نیور تھاٹ آف اِٹ!'' سوزیانا کو حیرت ہوئی، ''کیسے جائیں گے؟''

''یہاں سے چلاس تک پبلک ٹرانسپورٹ میں، وہاں سے بابوسر گاؤں تک جیپ سے، پھر ٹریکنگ کرتے ہوئے بابوسر پاس کراس کر کے رات پیل میں ٹھہریں گے۔ اگلی رات بٹاکنڈی پھر جیپ پکڑ کر پنڈی چلے جائیں گے۔'' عنایت نے تفصیل یوں بتائی جیسے کوئی فوجی کمانڈر اپنے دستے کو بریف کر رہا ہو۔

''ازنٹ اِٹ اے بیوٹی فل روٹ ارباب!'' سوزیانا نے اپنے میزبان سے کہا، ''اگر میں لندن لوٹنے سے قبل یہ خوب صورت ٹریک کرلوں تو کتنا اچھا ہوگا۔'' اس نے پھر

اسی کے لیے وقف کرنی ہے تو ٹھیک، البتہ اگر اس شام کچھ اور بھی کرنا ہے تو پھر مختصراً کہوں گا کہ میں نے غیر معمولی اور خوب صورت سبجیکٹ تلاش کیے۔''

''کیا مطلب؟'' سوزیانا نے فوراً پوچھا۔

''مثال کے طور پر آج میچ کے دوران آپ نے مردانہ چترالی ٹوپی پہنی ہوئی تھی جس پر ملیشیا کا مونوگرام لگا تھا۔ آپ نے میدان کے کنارے دیگر تماشائیوں کے ساتھ کھڑے ہوکر میچ دیکھا جو کہ سب مرد تھے۔ میرے لینس نے آپ کو فوکس کیا اور میں نے یہ تصویر بنالی، نہایت دل چسپ اور بے حد خوب صورت تصویر۔'' عنایت نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا تو ہر کوئی مسکرا دیا۔ سوزیانا نے شرماتے ہوئے کہا، ''تھینک یو! بٹ آئی مسٹ ہیو دس پکچر۔''

شیندور پر عنایت کی فوٹو گرافی کے حوالے سے یہ تین دن سخت مصروف گزرے۔ اس کے ہمراہ سوزیانا بھی فوٹو گرافی کرتی دکھائی دی۔ میں نے اکثر عنایت کا تھیلا اس کے کندھے پر دیکھا۔

رات کی محفلوں کا لطف ہی نرالا تھا۔ حالاں کہ ان محفلوں میں شریک اکثر لوگ خالصتاً دنیاوی اندازِ فکر رکھتے تھے اور اپنے اپنے حساب میں کامیاب زندگیاں گزار رہے تھے۔ مگر عنایت اپنے مخصوص انداز میں ایسے پہلوؤں پر گفتگو چھیڑ دیتا کہ ہنر اور فن کے لیے سب کے دلوں میں قدر بڑھ گئی۔

شیندور ٹورنامنٹ کے بعد ہمارا ارادہ دو دن کی ٹریکنگ کے بعد جیپ کے ذریعے گلگت پہنچنے کا تھا۔

سوزیانا اور اس کا میزبان ارباب جو کہ نوجوان ایم پی اے تھا، وہ بھی گلگت کے عازم تھے۔ مجھے اتنا پتا چل گیا تھا کہ سوزیانا کا دادا یا نانا انگریزوں کے دورِ حکومت میں پشاور کا کمشنر رہا تھا۔ اس نے اپنے کسی واقف کار کو خط لکھا تھا۔ یوں ارباب کے ذمے یہ میزبانی آئی تھی۔

ہم صبح سویرے نکلے تھے۔ جوں جوں شیندور سے دور ہوتے گئے، ہریالی بڑھتی

گئی۔ پروگرام کے مطابق دوپہر ایک بجے تک سوزیانا والے لینڈ کروزر میں وہاں آپہنچے اور ہم نے دوپہر کا کھانا مل کر کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ تو ہاتھ لہراتے ہوئے لینڈ کروزر چلے گئے اور ہم پیادہ چل نکلے۔

ٹیرو سہ پہر کو پہنچے۔ ریسٹ ہاؤس میں سامان سیٹ کرنے کے بعد عنایت میلے کپڑے دھونے میں مصروف ہوگیا۔ میں برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر موسم کا لطف لینے لگا۔

''عنایت! لگتا ہے کہ سوزیانا تمھارے متعلق سیریس ہے۔'' میں شرارت کے موڈ میں تھا۔

''ڈاکٹر! جاؤ فشنگ راڈ کے ساتھ، ایک آدھا ٹراؤٹ ہی شکار کر کے لے آؤ۔ ورنہ یہاں تو آلوؤں کے سوا کوئی شے نہیں ملے گی۔'' عنایت کی سنجیدہ آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ اس کا مشورہ اس قدر برمحل تھا کہ میں مذاق بھول کر اٹھ کھڑا ہوا اور راڈ اٹھالی۔

ہم جوں ہی گلگت پہنچے، سوزیانا سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ہوٹل میں ہمارا پتا کرنے آئی تھی۔ میں نے معنی خیز نظروں کے ساتھ عنایت کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ پایا۔ گلگت کے بعد عنایت کا پروگرام ہنزہ یا اسکردو جانے کا نہیں تھا بلکہ وہ غیرمتوقع طور پر وادیِ کاغان جانا چاہتا تھا۔ سوزیانا نے جب ہمارا پروگرام دریافت کیا تو عنایت نے مختصر جواب دیا۔

''کاغان۔''

''اوہ! آئی نیور تھاٹ آف اِٹ!'' سوزیانا کو حیرت ہوئی، ''کیسے جائیں گے؟''

''یہاں سے چلاس تک پبلک ٹرانسپورٹ میں، وہاں سے بابوسر گاؤں تک جیپ سے، پھر ٹریکنگ کرتے ہوئے بابوسر پاس کراس کر کے رات پیل میں ٹھہریں گے۔ اگلی رات بٹاکنڈی پھر جیپ پکڑ کر پنڈی چلے جائیں گے۔'' عنایت نے تفصیل یوں بتائی جیسے کوئی فوجی کمانڈر اپنے دستے کو بریف کر رہا ہو۔

''ازنٹ اِٹ اے بیوٹی فل روٹ ارباب!'' سوزیانا نے اپنے میزبان سے کہا، ''اگر میں لندن لوٹنے سے قبل یہ خوب صورت ٹریک کرلوں تو کتنا اچھا ہوگا۔'' اس نے پھر

عنایت کی طرف چہرہ کرتے ہوئے پوچھا، ''اگر میں آپ کے ساتھ چلوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟''

''اوہ پلیز!'' میں نے عجلت میں کہا۔ عنایت میری عجلت پر صرف مسکرا دیا تھا۔

گلگت میں ہم بھی دوسروں کی طرح دکانوں میں تانک جھانک رہے تھے۔ عنایت ٹریکنگ شوز کی تلاش میں تھا۔

''بھابی کے لیے تحفہ نہیں لو گے کیا؟'' میں نے شرارت کرتے ہوئے کہا۔

''خبردار! تم بھی کوئی بیوقوفی مت کرنا۔ ہمارے تھیلے پہلے ہی کافی وزنی ہیں۔ ان میں فضولیات کی گنجائش نہیں ہے۔'' اس نے سخت لہجے میں سمجھایا۔

گلگت میں دو دن ٹھہرے تھے اور سارا وقت مقامی بزرگ شخصیات سے ان کی روایات اور لوک کتھائیں سننے میں گزرا۔ سوزیانا اور عنایت ساتھ تھے۔ لوک ادب میں دل چسپی نے انھیں کافی قریب کردیا تھا۔ وہ بے چارہ کئی دنوں سے سوزیانا کا گائیڈ بنا ہوا تھا۔ یک لخت ایک اجنبی شخص آیا اور سب باتوں پر قادر ہوگیا۔ اس نے جانے کیسے خواب بُنے ہوں گے اور اب ان خوابوں کی حسین عمارتیں ایک ایک کرکے ڈھ رہی تھیں۔ مجھے رہ رہ کر اس پر ترس آ رہا تھا، لیکن پھر لوک کہانیوں کی تفصیلات میں کھو جاتا۔

ارباب ہمیں اپنی لینڈ کروزر میں بابوسر گاؤں تک پہنچا کر رخصت ہوگیا۔ اب سوزیانا ہمارے ساتھ تھی۔ اسے پہلی تاریخ کو کراچی سے اپنے ملک واپسی کے لیے فلائٹ پکڑنی تھی۔

''بابوسر ایک نہایت خوب صورت اور خاصا بڑا گاؤں ہے۔ یہاں رات گزار کر صبح سویرے چلا جائے گا۔ اس وقت کافی دیر ہوگئی ہے اور ہم بیسل تک بہت دیر سے پہنچیں گے۔'' عنایت نے فیصلہ صادر کیا۔

''یہ خوب صورت جگہ ہے، یہاں لطف آئے گا!'' سوزیانا نے فوراً عنایت کے پروگرام کی تائید کی۔

ریسٹ ہاؤس میں سامان رکھ کر عنایت اور سوزیانا نے اپنے اپنے کیمرے

کندھوں پر لٹکائے اور میں پانی کی بوتل لے کر ان کے ہمراہ چل دیا۔

''پہاڑی پر کھڑے چرواہے کی تصویر کتنی اچھی آئے گی۔'' سوزیانا نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''آپ اپرچز کو بھی دو اسٹیپ مزید بند کریں۔'' عنایت نے صلاح دی۔

''ان سے بھلا کیا فائدہ ہوگا؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''اصل چیز یہ ابر آلود آسمان ہے۔ پیچھے چھپی ہوئی سورج کی کرنیں، اطراف سے جھانک کر حسین منظر پیش کرتی ہیں۔ دور سے چرواہے کی صورت تو دکھائی نہ دے گی، نہ ہی یہ پتھر تصویر میں کوئی خوب صورتی دیں گے۔ ایسا کرنے سے فور گراؤنڈ ڈارک ہوجائے گا اور چرواہے کی Silhouette بادلوں سے گھرے آسمان کے ساتھ دل چسپ تضاد پیش کرے گی۔

یوں لینڈ اسکیپ فوٹوگرافی پر گفتگو جاری رہی اور سیر بھی ہوتی رہی۔ سہ پہر کو واپس لوٹے تو گاؤں کے لڑکے والی بال کی تیاری کر رہے تھے۔

''کیوں نہ چل کر کھیل کا مزہ لیا جائے،'' عنایت نے کہا۔ ''کیا؟ میں بھی چلوں؟'' سوزیانا نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، کیوں نہیں؟'' عنایت نے اصرار کیا۔

اس طرح ہم بھی چل کر والی بال کے کھیل میں شریک ہوگئے۔ عنایت نے سب سے کم عمر دو لڑکوں کو کپتان مقرر کیا اور انھوں نے قطار میں کھڑے کھلاڑیوں کو باری باری چنا۔ عنایت اور سوزیانا ایک طرف ہوگئے اور مجھے دوسری ٹیم نے منتخب کیا۔ میچ بہت دل چسپ رہا۔ پہلا راؤنڈ عنایت کی ٹیم نے جیتا۔ دوسرا راؤنڈ ہم نے جیت لیا۔ اب فیصلہ تیسرے راؤنڈ پر ہونا تھا۔ عنایت اچھا کھیل رہا تھا۔ سوزیانا بھی دو راؤنڈ کے بعد کھیل کو سمجھ چکی تھی اور اس نے کئی دفعہ بال اچھال کر عنایت کو دی تھی، لیکن ہماری ٹیم کا نثار نامی کھلاڑی اچھا کھیل کھیلتا رہا۔ اس نے پوائنٹس کا معاملہ سنبھالے رکھا۔ کھیل کا آخری مرحلہ تھا، ایک پوائنٹ گنوانے کا مطلب گیم ہارنا تھا۔ سب کھلاڑی پُر جوش تھے، میرا دل بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

نثار کو ایک بہت خوب صورت والی مارنے کا موقع مل گیا۔ اس نے اچھل کر ایسی والی ماری کہ واہ وا ہوگئی۔ ہماری ٹیم خوشی سے اچھلنے لگی۔ لیکن غیر متوقع طور پر سوزیانا نے زمین پر گرتے ہوئے یہ بال اٹھا لیا اور دوسرے لڑکے نے عنایت کو نیٹ کے عین اوپر بال لہرا کر دیا اور اس نے بھی کوئی رعایت نہ کی۔ خوشی بھری چیخوں سے گاؤں کی فضا گونج اٹھی۔ سوزیانا نے عنایت کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ ادھر ہماری ٹیم پر گویا پانی پھر گیا۔ میں نے سر جھکائے جا کر اپنی جیکٹ اٹھائی۔

''اِٹ از اسپورٹ ڈاکٹر! چیئر اَپ، یو پلیڈ ویل!'' میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو سوزیانا عنایت کے کندھے پر ہاتھ رکھے میری حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ ''تھینک یو'' کہا۔

''بس ہماری قسمت اچھی تھی وگرنہ آپ کی ٹیم تو قریباً جیت ہی چکی تھی۔'' عنایت نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ اس دوران میں خود کو پوری طرح سنبھال چکا تھا۔ سوزیانا اور عنایت کی قربت دیکھ کر شرارت بھرے انداز میں کہنے لگا، ''نصیب تو آپ کے واقعی اچھے ہیں، اس میں شک ہی کیا ہے!''

سوزیانا میری بات سن کر اپنی بانہیں عنایت کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے شوخ لہجے میں بولی، ''یو ناٹی ڈاکٹر!''

بابوسر پاس تک آٹھ میل کا سارا راستہ چڑھائی کا تھا اور یہی دشوار حصہ تھا۔ سوزیانا جس کے اصرار پر اب اسے سوزن کہا جانے لگا تھا، اس کا سامان ایک پورٹر کے سپرد تھا، اس نے بھی یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے کیا۔

سوزن نے بابوسر پاس کے چاروں اَور برف سے ڈھکے پہاڑوں کے پس منظر میں ہماری تصویر بنانا چاہی۔ ''میٹر کی ریڈنگ پر اپر چر سیٹ نہ کیجیے گا۔ یہ ریڈنگ چمکتی ہوئی برف کی ہے، ہم دھندلے دکھائی دیں گے۔'' عنایت نے دو انگلیوں سے برف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا کروں؟''

''اپنی جیکٹ کے بازو کو لینس کے رخ پر رکھ کر ریڈنگ لیں!''

''کیا— واقعی!؟''

''ہاں بھئی۔ آپ کی گرے جیکٹ پر پڑنے والی روشنی صحیح صورتِ حال پیش کرتی ہے، اس لیے کہہ رہا ہوں۔'' عنایت نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

سارے راستے گفتگو جاری رہی۔ کبھی بائرن کی شاعری نے سرد موسم میں حدت پیدا کی تو کبھی روڈن کے ذکر نے دل کو موم کیا۔ روڈن کی بات نکلی تو عنایت نے کچھ زیادہ ہی گداز کے ساتھ کہا، ''رِلکے جب پیرس جا کر اس کے ہاں رہا تو روڈن کے لیے اس کی عقیدت بڑھ گئی اور اس نے اپنی بیوی کے نام لکھے گئے خطوط میں روڈن کا ذکر جس ہمدردی اور گہری فکر کے ساتھ کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔''

''یقیناً رِلکے کی بیوی کا بھی ادب سے تعلق ہوگا، اسی لیے تو اس سے ایسی خوب صورت باتیں کر سکا۔'' سوزن نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا، ''فن کی دنیا میں اکثر یہ حقیقت دکھائی دیتی ہے کہ ادب شناس ساتھی کی بدولت فن کاروں کے فن میں نکھار آیا ہے۔''

''اگر دل کے تار چھیڑنے والا سُر تال سے واقف ہے تو پھر شعر بن جاتے ہیں۔ پتھر مجسمہ بن جاتا ہے، لکیریں صورت اختیار کر لیتی ہیں اور زندگی کے تھکے ہوئے چہرے پر گھڑی بھر کے لیے راحت کے احساسات چھا کر اس کے لافانی حسن کی جھلک دکھا جاتے ہیں۔'' عنایت نے سوزن کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سوزن نے بازو بڑھا کر عنایت کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور اس طرح ہمارا سفر جاری رہا۔

ہیسل سے کچھ پہلے لولوسر کی جھیل تھی۔ کنار ندی پہاڑی راستے، نشیب و فراز پھلانگتی، گرجتی، دوڑتی، بل کھاتی ہوئی اس جھیل میں آ کر گرتی ہے اور کچھ وقت اس کی پُرسکون قربت سے لطف اندوز ہو کر نئے سرے سے اپنا طویل اور کٹھن سفر شروع کر دیتی ہے۔

''میں نے تو آج تک لولوسر جیسی معصوم جھیل نہیں دیکھی۔'' عنایت نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''کس قدر موزوں لفظ استعمال کیا ہے!'' سوزن نے اس کے کندھے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''یہاں پہنچ کر مسافر اپنی تھکاوٹ اور پریشانیاں فراموش کر کے قیام کرنا چاہتا ہے مگر رُک نہیں پاتا۔ زندگی کے تقاضے اسے یہاں سے لے جا کر مسائل و مصائب کے سپرد کر ڈالتے ہیں۔ یہاں آپ کو انسانی آبادی دکھائی نہیں دے گی۔''

ہم ہیسل چار بجے تک پہنچ گئے تھے۔ چند گھروں پر مشتمل یہ بستی ہماری توقع سے بھی زیادہ چھوٹی تھی۔ اتنی طویل مسافت کر کے پہنچے تھے، نیز صبح سے لے کر کہیں سکون سے بیٹھ کر کھانا کھانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ سو خیمہ ایستادہ کر کے شکم سیری کی فکر کرنے لگے۔

''کھانا خود نہیں بنانا، کھانا ہم ہیسل 'انٹرکان' میں کھائیں گے۔'' عنایت جیکٹ جھاڑتے ہوئے بولا۔

ہیسل انٹرکان اک خیمے کے اندر واقع تھا۔ اندر آگ جل رہی تھی اور سردی کم تھی۔ مینو میں کل تین آئٹم تھے، دال، گوشت اور روٹی۔

''پلیز سرواس وتھ ہول مینو۔'' عنایت نے شاہانہ انداز میں دونوں ہاتھ بلند کر کے آرڈر دیا۔

''ہاؤ سویٹ!'' سوزن نے ہنستے ہوئے کہا۔ حیرت زدہ ہوٹل والے کو سمجھایا کہ ہمیں دال، گوشت اور روٹی دے۔ کھانے کے بعد گرما گرم چائے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ جسے ہم میدانی علاقوں میں صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں سکتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہیسل سے بٹاکنڈی کا راستہ تو دنیا کے چند خوب صورت راستوں میں سے ایک ہے۔ اگلے روز ہم اس راستے سے مکمل طور پر لطف اندوز ہوئے۔ یورپین لینڈ اسکیپ پینٹرز پر گفتگو کا آغاز تو سوزن نے کیا تھا، لیکن جب عنایت بولنا شروع ہوا تو اسے سننے میں واقعی ایک لطف تھا۔ پینٹنگز کا گہرا مطالعہ اور ان کو دیکھنے کا اس کا اپنا فنی زاویۂ نگاہ۔ لگتا یوں تھا کہ جیسے ہم اپنی نوجوانی میں یورپ میں بیٹھے پینٹنگ کا ارتقا دیکھ رہے ہوں۔

''یہ میری زندگی کے یادگار لمحات ہیں۔'' سوزن نے بے اختیار کہا۔

بٹاکنڈی تک راستے کے پیچ وخم اور نشیب و فراز نے ہمارے جذبات کو بھی متلاطم کر ڈالا تھا۔ خاص طور پر سوزن تو راستے کے حسن اور رفاقت کے احساس سے بے خود تھی۔ فطرت کے حسن اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں موجود محویت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ ہم جادو کے تاگے سے بندھے بٹاکنڈی آپہنچے۔ جہاں سے چائے پینے کے بعد کرائے کی جیپ پر روانہ ہوئے۔ ناران میں رات بسر کی اور صبح پنڈی کے لیے روانگی طے پائی، کیوں کہ اگلے روز سوزن نے کراچی سے لندن کے لیے جہاز چڑھنا تھا۔ میں نے ٹراؤٹ کے شکار کی خاطر ناران میں مزید ایک دن ٹھہرنے کی بات کرتے ہوئے کہا، ''ہم بروقت کراچی نہیں پہنچ سکیں گے۔ بہتر یہی ہوگا کہ ٹوور کو بڑھا دیا جائے۔'' اس پر سوزن نے عنایت کی جانب دیکھا لیکن عنایت نے تو جیسے کسی بات کا نوٹس ہی نہ لیا ہو۔

شام کو پنڈی پہنچ کر عنایت نے کسی کو فون کیا اور ہم سیدھے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیپ والے کو فارغ کر کے ڈومیسٹک ڈپارچر لاؤنج کا رخ کیا۔ میں حیران تھا کہ ٹکٹوں کے بغیر ہمیں کیوں کر اندر جانے کی اجازت ملے گی۔ میں عنایت سے یہی کہنا چاہتا تھا کہ دفعتاً میری نگاہیں میجر اعظم پر جا پڑیں۔ وہ ہاتھ سے اشارے کر کے ہمیں لاؤنج کی طرف بلا رہا تھا۔

''کیا کرتے ہو، بھئی اناؤنسمنٹ ہوچکی ہے۔ یہ رہیں آپ کی ٹکٹیں اور اب آپ ہوجائیں روانہ۔'' اس نے عنایت کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا، ''سر آپ بہت ذلیل ہیں، ایک دن بھی پنڈی رک نہیں سکتے۔'' وہ عنایت کا بے تکلف دوست تھا۔ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا، ''ذرا مزید فرمائیں۔''

میجر اعظم نے مجھے دھکا دے کر آگے بڑھا دیا۔

کراچی پہنچے تو سوزن کی فلائٹ میں ابھی چار گھنٹے تھے۔ لہٰذا ہم ایئرپورٹ پر ہی بیٹھ گئے۔ سوزن بے حد اداس تھی۔ دو گھنٹے تو تقریباً خاموشی کی نذر ہوگئے۔ سوزن گھڑی دیکھتے ہوئے آہستگی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''اچھا اگر کچھ روز ٹھہر کر لندن جاؤ تو کون سی قیامت آجائے گی، رُک جاؤ۔''
بالآخر میں چپ نہ رہ سکا۔

''اگر عنایت کو منظور ہو تو میں ساری زندگی یہاں رہنے کے لیے تیار ہوں۔''
اس نے دکھ بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کی آنکھوں میں امید کی ننھی سی چنگاری دیا جلانے کو بے قرار تھی۔

عنایت نے فلائٹ انفارمیشن بورڈ کی طرف نگاہ کی، جہاں Now check in کا اشارہ اسپارک کر رہا تھا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے زور سے دانت بھینچے تو اس کے گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ سوزن کی آنکھوں میں دکھ کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا آیا اور آکر اس کی چنگاری کو بجھا دیا۔ عنایت نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی بھی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا۔ سوزن بے اختیار ہوکر اس سے لپٹ گئی۔ عنایت نے اسے سر پر بوسہ دے کر الوداع کیا۔

''ڈاکٹر اپنا خیال رکھنا۔'' سوزن نے میرے رخسار پر بوسہ دیتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا، ''عنایت کا خاص طور پر خیال رکھنا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ وہ ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوگئی۔ عنایت چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا بنچ پر جا بیٹھا۔ وہ کسی گہرے خیال میں گم تھا۔ شدید دکھ کا بوجھ میری قوتِ برداشت سے باہر تھا۔ اب مجھے عنایت پر طیش آنے لگا تھا، ''تم اس کے جذبوں کا بھی خیال نہیں کرتے۔'' دکھ اور صدمے کے باعث میں مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

عنایت نے لاؤنج کے دروازے کی طرف دیکھا اور مجھے دیکھ کر گردن جھکالی۔

''تم اسے روکتے کیوں نہیں؟'' میں چلایا، ''یہ سزا آخر تم کس کو دے رہے ہو؟''
میں نے اس کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

عنایت نے گردن اوپر اٹھائی، اس کی آنکھوں میں اداسی کی دیواریں کھڑی تھیں۔

''ڈاکٹر! سوزن کو کیسے روک لوں؟ گاؤں میں بھی تو ایک سوزن بیٹھی ہے۔''

کلیم لاشاری تحقیق کے میدان میں منفرد انداز رکھتے ہیں، محنتِ شاقہ اور دقیق نظری اُن کے کام کا خاصہ ہے۔ پتھر کی تراشیدہ قبروں پر ان کی تحریریں عرصے سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ اسی موضوع پر ان کی کتاب پہلے پہل انگریزی زبان میں ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔

آثارِ قدیمہ اور تاریخ میں دل چسپی نے ان کی تحقیق کو نئے اور مشکل موضوعات دیے، انھوں نے پوسٹ ڈاکٹریٹ (**DAAD Fellowship**) کے لیے برلن میں اسلامی فنون کے میوزیم میں کام کیا۔

بعدازاں امریکا کی وسکانسن یونی ورسٹی سے **Post Doctoral** فیلوشپ مکمل کی۔ قدیم ورثے کی حفاظت اور دیکھ بھال سے متعلق امور پر اُن کی گہری نظر رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سندھ میں محکمۂ قدیم ورثہ کی بنا ڈالی اور تاریخی آثاروں کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا۔

تہذیب وتمدن میں ان کی دل چسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بہت سی دشوار گزار اور انوکھی راہیں چنیں۔ دریائے سندھ کی مہم جوئی سے انھوں نے ہر خاص وعام کی توجہ قدیم ورثے کی طرف مبذول کروانے میں قابلِ قدر کامیابی حاصل کی۔ اسی نوعیت کے قدرے دل چسپ موضوعات پر، جن میں رنی کوٹ، دریائے سندھ کا ڈیلٹا اور کھیرتھر کی دشوار گزار پہاڑیاں شامل ہیں، تحقیق کی نئی جہتوں کا تعین کیا۔

سندھ ایکس پلوریشن اینڈ ایڈونچر سوسائٹی، جس نے قدیم ورثے کی حفاظت اور تحقیق میں خاصا نام پیدا کیا ہے، کلیم لاشاری اس کے بانی اور سرگرم رکن ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں ادب سے بھی گہری دل چسپی ہے، ان کے افسانے مدافعتی ادب میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں کا سندھی میں ایک مجموعہ ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔ زیرِ نظر کتاب اس مجموعے کا اردو ترجمہ ہے جو کتاب کے اصل (سندھی نام ہی) سے پیش کیا جارہا ہے۔

ACADEMY BAZYAFT

اُنّیس سو تراسی

ISBN : 978-969-540067-8
9 789695 400678